

UNIVERSITY OF KASHMIR

Acc. No. 25214

Author میر (ذوالفقار الحق)

افتر سلطان

UNIVERSITY OF KASHMIR
LIBRARY



DATE LABEL

14 MAY 1978

Call No. _____

Date _____

Acc. No. _____

UNIVERSITY OF KASHMIR LIBRARY

This book should be returned on or before the last date stamped above. An over-due charge of 10/20 Paise will be levied for each day, if the book is kept beyond that date.

۱۸۶

اخر سلطانہ

(ناول)

ذوالفقار الحق مہر

شیخ غلام محمد اینڈ سترتا جران
"قرآن منزل"
بازار امیر اکدل سریشگر شیر

ملتبہ سلطانی عبی ۳

عسوالا

جملہ حقوق بحق پبلیشر محفوظ

باراؤل اگست ۱۹۴۸ء

U3

94747

قیمت غیر اکیروپہ آٹھ آنہ

۸۹۱۰

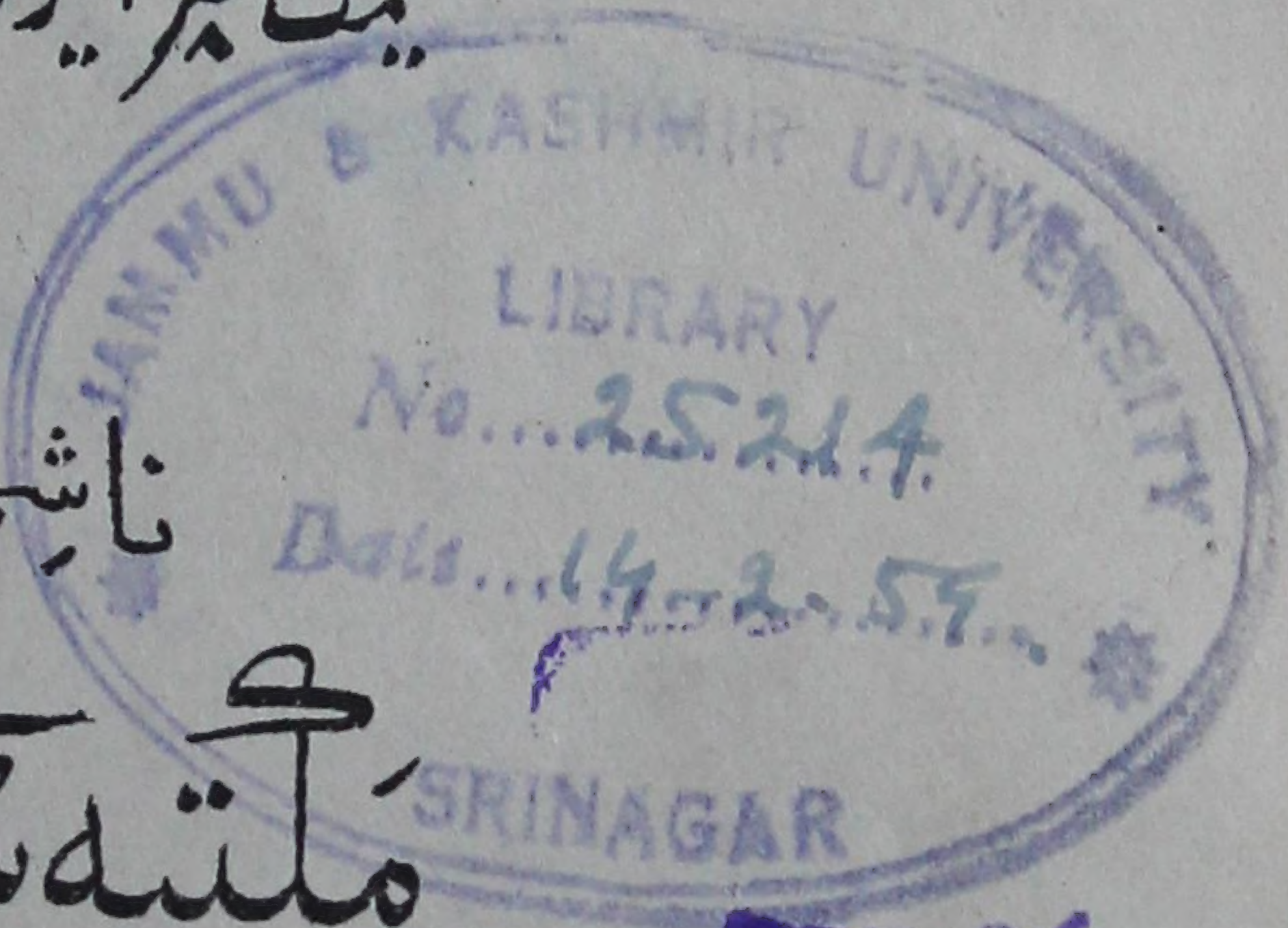
۱۰۰

1885

ناشی

ملتبہ سلطان

ابراہیم رحمت احمد روٹ۔ بمبئی ۳



۱۱۲



پریسٹر و پبلیشر سلطان حسین اینڈ سنز نے سلطانی فائن آرٹ لیتھو
اینڈ پرنٹنگ پریس بھنڈی بازار بمبئی ۳ سے چھاپ کر وہیں سے
شائع کیا

پیش لفظ

عادل رشید

پیش لفظ :

ہندوستان نے اچھے اچھے ناول نگار پیدا کئے ہیں اور ادب کے اس گوشہ کی چھان بین اگر آپ کریں تو آپ کو علاوہ اور زبانوں کے اردو زبان میں بھی اچھے ناولوں کی معقول تعداد مل سکتی ہے۔

اردو زبان کے ممتاز ناول نگاروں میں مولینا عبدالحلیم شرر کا درجہ کافی اہمیت رکھتا ہے اور مولینا کے بعد اور بہت سے نئے نئے ناول والوں نے ان کے رنگ کو اپنانے کی جدوجہد کی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان کی یہ کوششیں ایک حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی ہیں۔

زیر نظر ناول "اختر سلطانہ" ذوالفقار الحق صاحب قہر کی

ایک اسی قسم کی کوشش ہے۔ موصوف نے اس ناول کے ذریعہ
مولینا کے شہر کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے
وہی انداز اختیار کرتا چاہا ہے جو شہر صاحب کے ناولوں کی خصوصیات
تھیں۔

مولینا شہر کے ناولوں کا انداز بیان بڑا گھریلو، بڑا موثر اور
بڑا لطیف ہوتا ہے آپ کو کسی جگہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ کسی مبلغ کی
تقریر سن رہے ہیں یا کوئی اُستاد جبراً آپ پر اپنا فلسفہ ٹھونس رہا ہے
بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمام واقعات اپنی جملہ حقیقتوں کے ساتھ
آپ کے سامنے سے گزر رہے ہیں اور آپ ان کی طرف سے ایک سکند
کے لئے بھی بد دل نہیں ہو سکتے۔

کردار نگاری کا مکمل آرٹ شہر مرحوم کو جیسے قدرت
کی طرف سے بطور عطیہ ملا ہو۔ اور وہ اُسے بڑی فیاضی اور کمال صناعی
سے استعمال کرنا جانتے تھے۔

”اختر سلطانہ“ ناول پر دیباچہ لکھنے سے پہلے میرے ذہن
میں ایک کامیاب ناول کی جملہ خصوصیات کروٹیں بدل رہی تھیں۔ لہذا
میں نے انہیں خصوصیات کی کسوٹی پر ذوالفقار الحق صاحب قہر کے اس
ناول کو پرکھنا شروع کیا۔

اور پورا ناول پڑھ چکنے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ قہر صاحب
میں ناول نگاری کی تمام صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں اور اگر وہ ذرا اور

احسب طے سے کام لیں اور اپنی جولانی طبع کو سنبھال سنبھال کے
کام میں لائیں تو وہ اچھے بہت اچھے ناولسٹ بن سکتے ہیں۔

شہر مرحوم کے آرٹ کا عکس اُن کے اس ناول میں جگہ جگہ موجود ہے
وہ اپنی قوت بیان کے ذریعہ لوگوں کو اپنا سکتے ہیں۔ اور اگر وہ ذرا سی اور
محنت کو جائز سمجھ لیں تو ان کا شمار ہندوستان کے اچھے ناول نگاروں
میں آسانی کے ساتھ شامل کر لینے میں بڑے سے بڑے نقصان کو بھی
تامل نہ ہوگا۔

ذوالفقار الحق صاحب تہر کے یہاں ابھی کئی چیزوں کی کمی ہے۔
نفسیاتی تجزیہ۔ کرکیٹرز ٹی زیشن اور منظر نگاری۔ پلاٹ کو اتنا الجھا نا
کہ وہ گتھتی کی شکل اختیار کر لے اور یہ یقین کامل ہو جائے کہ اب یہ گم ہیں
زندگی بھر نہیں کھل سکیں۔ مگر پڑھنے والا نہ اچھے بلکہ اس الجھاؤ سے
اُس کی دلچسپیاں بڑھتی جائیں اور پھر آگے جا کر وہ الجھی ہوئی گتھیاں جو
سلجھ ہی نہ سکتی تھیں اس طرح آپ ہی آپ سلجھتی جائیں کہ پڑھنے والا
عشق عشق کر اٹھے۔ بڑے کمال کا فن ہے۔ بڑی اہم اور مشکل چیز ہے۔
اور یہ بات آج کے کسی بھی ناول نگار کو حاصل نہیں ہے۔ البتہ تہر صاحب کے
یہاں اس آرٹ کی جھلک نمایاں ہے اور ذرا سی محنت سے یہ جھلک اور اجاگر
ہو سکتی ہے۔

حادثات کی تکرار یکے بعد دیگرے حادثات کا ڈھیر لوگوں کو
اکتا دیتا ہے۔ اور پڑھنے والا یہ سمجھنے کے لئے قطعاً حق بجانب ہوتا ہے کہ

محض ناول کے صفحات کے نمبروں کی تعداد کا خیال مصنف کو حادثات کا
شکار کئے ہوئے ہے، وزن ناول کا پلاٹ تو کب کا دم توڑ چکا۔
یہ سب سے بڑی کمزوری ہے جو اکثر ناولسٹوں میں پائی جاتی ہے
مگر قہر صاحب نے اس کی طرف سے احتیاط برتنے کی کوشش کی ہے۔
لیکن ابھی اور احتیاط کی ضرورت ہے۔

مجموعی طور پر ناول "اختر سلطانہ" دلچسپ اور موثر ناول ہے اور
اسے پڑھ کر آپ اپنی دلچسپیوں کو یہ قرار رکھ سکیں گے۔ یہ ناول آپ پڑھئے
اور قہر صاحب سے آئندہ اس سے اچھے ناولوں کی توقعات قائم کیجئے۔ وہ
آپ کی حسین توقعات کا خیر مقدم ضرور کریں گے۔

عادل رشید
بمبئی - ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء

بہارِ عریضہ
جلد اول

باب

وہ سوچ میں پڑ گیا

دلا وہ چمک میں تمباکو والے کے یہاں بیٹھا ہوا ایک شریف عورت کو درجو کپڑے
کی دوکان سے عید کے لئے سرخ جوڑی کی ساری خرید رہی تھی، سیٹی بجا بجا کر
اپنی طرف متوجہ کرنے کی فضول کوشش کر رہا تھا۔

یگا یک ایک خوفناک آواز اُسی کے کان کے پردے سے ٹکرائی۔ وہ چمک
پڑا۔ پلٹ کر اس نے دیکھا۔ اب وہ مسکرا رہا تھا۔ سامنے سے ایک موٹر آہستہ آہستہ
جا رہی تھی جس میں جنت کی حوریں۔ گوہ قاف کی پریاں۔ نرالی بانگلی اداؤں کیساتھ
جلوہ افروز تھیں۔ موٹر کے پیچھے بنیڈ تھا۔ اور بنیڈ کے پیچھے ایک خاص قسم کا باجہ
جس کی آواز بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک سے زیادہ دہشتناک تھی۔ موٹر والی
حسین عورتیں دل لہانے والے انداز کے ساتھ کاغذ کے پرزوں سے سڑک کو

لے جنوبی افریقہ کے اس شہر کا بڑا بازار جہاں ہندوستانیوں کی کافی آبادی ہے۔ ہندوستان کو
یہ آزادی ملنے کے بعد جنوبی افریقہ کی گورنمنٹ کا دماغ بھی اب صحیح ہو چلا تھا۔ ہندوستانیوں کیساتھ
برتاؤ بھی پہلے سے اب چھا ہونے لگا تھا۔

ڈھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن اُن کی یہ کوشش محض بیکار تھی کیونکہ ابھی
 وہ کاغذ کا پرزہ کرنے بھی نہ پاتھا کہ مخلوق پاگلوں کی طرح دوڑ کر اس کو بھپٹ
 لینے کی کوشش کرتی تھی۔ گویا وہ بیکار کاغذ کا پرزہ سو روپے کا نوٹ تھا۔
 دلاور کو بھی ایک پرزہ مل گیا۔ یہ تھیٹر کا اشتہار تھا۔ کل رات کو ساڑھے نو بجے
 موٹی محل تھیٹر میں ایک ایسا ڈرامہ دکھایا جائے گا جو آج تک دنیا کے پردے پر
 کسی تھیٹر کمپنی نے نہ دکھایا ہوگا۔ دلاور نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔
 وہاں صرف ایک آنہ تھا تو وہ اس عجیب و غریب ڈرامہ کو دیکھنے سے

محروم رہے گا۔ کیا کیا جائے۔ ؟ قرض ہاں۔
 لیکن قرض کون دیگا۔ ؟ زمانہ جانتا ہے کہ دلاور کو قرض دینا، پیسہ کو پانی میں
 پھینک دینا ہے۔ پھر؟ لیکن کچھ بھی ہو، ڈرامہ تو وہ ضرور دیکھے گا۔ مگر کیسے بٹک
 سکے وام ؟ دلاور سوچ میں پڑ گیا۔ آج
 اُس کی قسم ٹوٹ کر رہے گی۔ پانچ برس کی جیل بھگتنے کے بعد اُس نے قسم کھائی
 تھی کہ آئندہ کبھی چوری نہ کرے گا مگر آج کوہ قاف کی پرہیزگاروں نے اس پر ایسا جادو
 کر دیا کہ سچا رہ دلاور اپنی قسم توڑ کر چوری کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کاہلے کے لئے؟
 صرف پرستان میں ان پرہیزگاروں کی ایک ادا دیکھنے کو۔

باب

”کون کون ہے؟“

رات کے بارہ بجے ہون گئے۔ ہر ایک جاندار اپنے مسکن میں دنیا و باہما سے

بے خبر آرام و چین کی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی بغور تارکی
سارے عالم پر حکومت کر رہی تھی لیکن غور کا سرخیا کبھی کبھی بجلی صرف تارکی کا
غور توڑنے کے واسطے ساری دنیا کو لحظہ بھر کے لیے منور کر دیتی تھی۔ سڑک پر
ایک شخص کالا کبیل اور مٹھے تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ ایسی موسلا دھار بارش اور
اندھیری رات میں اور پھر کے بارہ بجے، اس کو ایسی کیا پڑی تھی جو اپنا نرم و گرم
بستر چھوڑ کر اس طرح مھینا دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

اب وہ ایک گلی میں مڑ گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ شہر سے نکل کر ویرانے کی طرف
سڑک پر دوڑنے لگا۔ اب اس نے اس طرف کا رخ کیا جہاں کچھ افسران اور کمرہ دستی
تجار تندرستی کی خاطر شہر سے دور جنگلوں میں آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ تھوڑی
دیر بعد یہ کالے کبیل والا عجیب و غریب انسان ایک مشہور کروڑ پتی تاجر سیٹھ محمود بھائی
کے بنگلے کے قریب کھڑا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ الغرض دیوار پھاںد کو وہ باغ میں داخل
ہوا۔ دو منٹ بعد وہ بلی کی طرح دبے پاؤں بنگلے کے برآمدے میں سے ہو کر بال
میں داخل ہو رہا تھا۔ بنگلہ اس قدر تاریک تھا کہ بھوتوں کا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے
اپنے چھوٹے سے ٹارچ کو ہوشیاری سے روشن کیا اور بال کی چیزوں کا ایک بعد
دیگرے معائنہ کرنے لگا۔ میزوں کی ساری دراز میں اُس نے کھولیں اور بند کیں۔
لیکن کوئی چیز مطلب کی نہ پا کر وہ بڑے روم میں داخل ہوا۔ اپنے ٹارچ کی روشنی
میں مہری کے قریب منبر پر اس نے ایک چیز دیکھی۔ دلاور کی بال ٹاپ پڑی آہستہ
سے اُس نے اس قیمتی شے کو اٹھا لیا۔ یہ سچے موتیوں کا ہار تھا جو سیٹھ محمود نے اپنی لادلی
اکھوتی لڑکی سلطانہ کو اس کی سالگرہ کے دن کل ہی دیا تھا۔ سلطانہ نے رات کو

اُسے میرا انا کر رکھ دیا تھا۔ پھر وہ ذرا لیٹ گئی تھی رات وہ ٹینس کا بیج کر بیجا
تھک گئی تھی اس نے خیال کیا کہ وہ ابھی اٹھ کر بار کو حفاظت کے ساتھ سیف میں
بند کر دے گی۔ مگر نیند کی دیوی نے کچھ ایسی لوری دی کہ بیجاری سلطانہ پاس ہزار
کی مالیت سے غافل ہو کر گری بیٹھی نیند سو لی۔ الغرض بار حفاظت کے ساتھ مسٹر
دلاور کے گوٹ کی حبیب میں رکھا گیا۔

مسہری کے قریب والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ بجلی چکی اور اس کی سفید شفاف
روشنی میں دلاور نے سلطانہ کے منور چہرے کو دیکھا۔ اُف، کتنی خوبصورت نوجوان
لڑکی! دلاور اپنے موچھوں پر تاؤ دینے لگا۔ اتنے میں کھٹکا ہوا اور وہ چونک پڑا۔
اب وہ دبے پاؤں بڈروم سے نکل کر ڈرائنگ روم سے ہوتا ہوا برآمدے میں سے
گزر رہا تھا کہ اس کو خیال آیا اوجہ اس کے پاس ایک قیمتی شے تھی تاہم وہ کل تھیسرے دوپہنے
سے محروم رہے گا کیونکہ بار کا اتنے جلد اور خصوصاً اس شہر میں فروخت ہونا ناممکنات میں تھا
کل شہر کے ہر اخبار میں سلطانہ کے قیمتی ہار کی چوری کا کچھ نہ کچھ تذکرہ ضرور ہوگا۔ دلاور
ایک منٹ برآمدہ میں کھڑا سوچا رہا۔ پھر اُسے پیروں چلا اور اب وہ سیٹھ محمود کے
بڈروم میں مشہور تاجر کے کپڑوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ سارے کپڑے اُس نے دیکھ
ڈالے۔ اس کی ناامیدی بڑھتی جاتی تھی۔ الغرض وہ خوشی کے مارے اچھل پڑا اسکی
انگلیوں کی پیروں کو نوٹوں کا احساس ہوا وہ اپنے تارچ کی روشنی میں ان کو کن
رہا تھا۔ دس دس روپے کے دس نوٹ۔

اُس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ کل رات کو ساڑھے نو بجے موتی محل ٹھیسر
میں۔ آخر کار کبس اُس کے لیے رہنہ ہوگا۔ اتنے میں سیٹھ محمود نے کر دٹ بدلی۔ کھانا

اور اپنی گریخت آواز میں ڈپٹ کر کہنے لگا۔

”کون؟“ ”کون ہے؟“

دلاور چونک پڑا۔ بھاگ کر کھڑکی تک آیا۔ پاؤں جوڑ کر نیچے کودا اور بات کی تائیدی میں غائب ہو گیا۔ ایک منٹ تک چور چور کی آواز اس کے کان کے پردے کو چھپاتی رہی۔ پھر بادول کی گرج، بجلی کی کڑک اور موسلا دھار بارش کی آواز کے آگے نیست و نابود ہو گئی۔

باب

”اگر اس کا بس چلتا تو۔۔“

ٹھیک ساڑھے نو بجے موتی محل ٹھیٹھڑکے اسٹیج کا پردہ اٹھا۔ دلاور شاید باکس میں بیٹھا ہوا لپچائی ہوئی نظروں سے ریستان کی سیر کر رہا ہو گا۔ لیکن نہیں اپنے دوستوں کے ساتھ فرسٹ کلاس میں بیٹھا پلٹ پلٹ کر وہ باکس والی کسی حسین ڈھیر کو گھور رہا تھا۔ (ڈرامہ کی جیسی تعریف کی گئی تھی ویسا نہ تھا)۔ اس ایک دست اصرغ نے کہا۔

”دلاور، تماشہ دیکھتے ہو یا۔۔“

”اوٹھ“ دلاور نے کہا۔ ذرا دیکھ تو سہی۔ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے وہ بولا۔

”کتنی حسین لونڈیا ہے۔ ذرا ابھار تو دیکھ اس ظالم کا۔ ہائے تری کافر جوانی۔۔“

کاش آج کی رات۔۔۔

دلاور خاموش رہا۔

اصغر: ”یہ سیٹھ محمود بھائی کی لڑکی سلطانہ ہے۔ اس کا حسن تو شہرہ آفاق ہے دیکھو اگر تم جیسے کالے بعلول پر تو وہ تھوڑے بھی نہیں۔“

”گلے“ بجنھلا کر دلاور بولا۔ ”اچھا بیٹا، ایک دن دیکھ لینا۔ اگر تیری ان تلی جیسی آنکھوں کے سامنے اسی اٹھتی کوئیل کی باہیں میرے گلے میں نہ ہوں تو میرا نام آج سے دلاور نہیں بندل۔“

”ہنہ“ ہنس کر دلاور کا مذاق اڑاتے ہوئے اصغر نے کہا۔ ”ہاں تو بھائی

دلاور وہ کون سا دن ہوگا شاید قیامت کا۔۔۔“ یا سفید جمبریاں؟
دلاور کو غصہ آگیا۔ دانت پیستے ہوئے اُس نے کہا۔ ”اچھا تو وہ دن تجھے
برا ہی دوں۔ آج کون سا دن ہے؟“

اصغر: ”الوار۔“

دلاور: ”الوار؟“ کل کون سا دن ہوگا؟

اصغر (سکرا کر) پیر۔“

”نکال اپنی نوٹ بک“ حجابیت سے دلاور نے کہا۔ اور لکھ لے پیر کے دن شام کے چھ بجے اور رات کے بارہ بجے کے درمیان لڑکی اپنے مکان سے غائب ہو کر تیری ان چندھی آنکھوں کے سامنے دلاور کی گود میں بیٹھی ہو گئی۔“
”لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟“ اصغر نے مسکرا کر کہا۔ میری یادداشت

اُس کے حسن اور تیری بد صورتی کی طرح شہرہ آفاق ہے۔“
”دلاور نے جیسے سننا ہی نہیں۔ اُف کتنی گرا ری نوٹ یا ہے کہنت؟“

ایک بیس سالہ خوشرو نوجوان ان بد معاشوں کے قریب بیٹھا ہوا ان کی
گفتگو کان دہر کر سُن رہا تھا۔ یہ غریب اپنے دل میں پیچ و تاب کھار رہا تھا اور اگر
اس کا بس طاقت تو دلاوری کی گردن ٹھونٹ کر اس کے جسم کی بوٹی بوٹی کر کے
چیل کوڑوں کو کھلا دیتا۔

باب

”کوئی اختر کے دل سے پوچھے“

پیر کے دن شام کو جانسن کالج میں سٹکپیئر کا مشہور ڈرامہ مرحیٹ آف
دینس ”دلکھائے جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔“

پویشیا کا پارٹ سلطانہ کو ملا تھا اور انٹونیو کا اختر کو۔ یہ وہی بیس سالہ
خوشرو نوجوان تھا جو تھیٹر میں دلاور اور اس کے دوستوں کے پاس بیٹھا ہوا
اُن کی گفتگو سُن کر آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ سلطانہ اور اختر ایک ہی درجے میں پڑھتے
تھے۔ اختر دل و جان سے سلطانہ پر تیار تھا مگر اس کی محبت کسی پر ظاہر نہیں ہوئی۔
یہاں تک کہ سلطانہ کو بھی علم نہ تھا کہ اختر اُسے چاہتا ہے۔

اختر کالج کی لڑکیوں سے بہت کم ملتا جلتا تھا۔ سلطانہ سے بھی شاذ و نادر
ہی گفتگو ہوتی تھی۔ گو دل سے تو وہ ہی چاہتا تھا کہ ٹیٹسٹوں بیٹیکر سلطانہ سے
باتیں کیا کرے لیکن جب سلطانہ اُس سے مخاطب ہوتی۔ اختر کا دل زور زور سے
دہر کرنے لگتا۔ ہاتھ پیر برف ہو جاتے اور کسی نہ کسی بہانے سے اسکو اکٹھا پڑتا۔

بہر حال سلطانہ کی زبان سے نکلے ہوئے وہ چند الفاظ اُس کے دل کی کتاب کے پہلے ورق میں درج ہو جاتے۔

لیکن ادھر ایک مہینہ سے ڈرامہ کی پریکٹس اور ریسرل کے سلسلہ میں سلطانہ اور اختر میں پہلے سے زیادہ بات چیت ہونے لگی تھی لیکن یہ سب ڈرامہ کے متعلق تھی۔ اختر کے دل میں جو ڈرامہ پورہ تھا سلطانہ کو اس کا کیا پتہ۔

ایک دن ڈرامہ کی پریکٹس میں سلطانہ نے اختر سے اپنی شیریں آواز میں کہا تھا: اختر صاحب! آپ ان لپروں میں بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کچھ جھنب سا گیا تھا۔ سلطانہ زور سے ہنس پڑی تھی۔ آہ اوہ ہنسی کی آواز کیسی پیاری تھی۔ کوئی اختر کے دل سے پوچھے۔

یہ اختر تھا کون؟ .. بیچارہ اختر ایک غریب آدمی کا لڑکا تھا۔

اس کے باپ کا انتقال اس کے بچنے ہی میں ہو چکا تھا اور مصیبت زدہ ماں نے سلاخیاں سی سی کر خاتمے کر کے اپنے لاڈلے اختر کو میٹرک تک تعلیم دی تھی۔ اختر ذہین اور عقلمند تھا۔ اُس نے اپنی بوہ مصیبت زدہ ماں کی محنت و مشقت کی کمائی ہوئی ایک ایک پائی کی قدر کی اور اس کو سو روپے کا نوٹ سمجھ کر پڑھنے میں جان توڑ محنت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اختر میٹرک میں تین ہزار طالب علموں میں اول آیا۔ اور یونیورسٹی کی طرف سے اس کو پچاس روپے ماہوار وظیفہ ملنے لگا۔ ماں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اختر کی ہمت بڑھ گئی اور اب سوائے پڑھائی کے اُسے کچھ نہ سوچتا تھا۔ لیکن نہیں۔ پڑھتے پڑھتے سلطانہ کی یاد اُس کو بچپن کی دہائی اور وہ کتاب بند کر کے عشق کی گہرائیوں میں اتر جاتا۔ پھر وہ اپنے آپ سے سوال کرتا۔

”سلطانہ کو کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے؟“

”دنیا میں شہرت اور روپیہ حاصل کر کے“

”شہرت اور روپیہ کیسے مل سکیں گے؟“

”تعلیم حاصل کر کے“

وہ اپنی کتاب کھول کر پڑھنے لگا اور پھر ایسا غرق ہو جاتا کہ اسے کھانے

کی بھی پروا نہ رہتی۔

اختر کالج بھرمیں ہر دلعزیز تھا۔ کئی مرتبہ کالج کے ڈراموں میں اسے انعامات مل چکے تھے۔ اس دفعہ بھی اختر نے اپنا پارٹ اس خوبی سے ادا کیا کہ تالیف بجاتے بجاتے لوگوں کے ہاتھ دھو لکھے۔ اور ”گولڈ کپ“ اسے انعام میں دیا گیا۔ سلطانہ کو ملے۔

باب

”لیکن اس کی سائنس رک گئی“

سارے دن بھر رات کو جانش کالج میں ڈرامہ دیکھ کر لوگ اختر کی تعریف کرتے ہوئے اپنے اپنے گھر جا رہے تھے۔

سلطانہ کالج کے باہر آئی لیکن اپنی کار نہیں اسکو نظر نہ پڑی۔ ”پہنسی“

اس نے اپنی ایک ہندو دوست سے کہا: ”میری کار اتنا تک نہیں آئی۔ تعجب ہے۔“
 کہا تم اپنی کار میں مجھے گھر تک چھوڑ سکتی ہو؟

ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔ پدمنی نے ہنس کر جواب دیا: "اوتار۔ گھر تک کیا۔ میں تو تمہیں
 تھکے دوڑھاکے گھر تک پھوڑاؤں گی۔"
 "چپ شری۔ سلطانہ نے پدمنی کو مذاق سے پھیرتے ہوئے کہا۔ اور اس کے
 ساتھ موٹر میں بیٹھ گئی۔ موٹر پچاس میل فی گھنٹہ کی تیز رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی
 چلی جا رہی تھی۔

ہاں یہ تو بتاؤ۔ مسکرا کر مذاقاً پدمنی نے کہا۔

"پیاری سلطانہ کب تک دلہن بنیں گی؟"

سلطانہ بولی: "جب پدمنی کی شادی ہو جائے گی تب۔"

"پدمنی کی شادی؟" سلطانہ کی رائ پر مکارہ سو کرتے ہوئے پدمنی نے دنت

پس کر کہا: "پدمنی کی شادی تو ہو لئی۔"

"کبوتر کے ساتھ؟" پیشانی پر شکن ڈال کر مسکراتے ہوئے سلطانہ نے پوچھا۔

"نہیج۔" پدمنی منہ بنا کر بولی: "موتے کبوتر کے ساتھ کا ہے کو ہوتی۔ بوی

اگر تم ان کو دیکھ لو تو سچ کہتی ہوں منہ میں پانی بھر آئے۔ کیا حسین بانکا نو جوان

ہے۔ ابھرا ہوا سینہ۔ گول گول بازو۔ دل چاہتا ہے کہ بس۔۔۔۔۔"

"کون ہے؟" سلطانہ نے پوچھا۔

"منشی لال،" پدمنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ راجہ لنگا پر شاد کا اکلوتا لڑکا۔

"گڈ۔" سلطانہ بولی۔ پدمنی میں تم کو مبارکباد دیتی ہوں کہ ایسا ہونا۔

لوٹو اٹھارے حصہ میں آیا۔ کیا بات بالکل کچی ہو گئی؟

"بالکل۔" ہنستے ہوئے پدمنی نے کہا۔ مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میری

شادی بھی ہو چکی کیونکہ ایک منٹ کیلئے بھی تو وہ مجھے جدا نہیں ہونے دیتے۔ خواب میں۔
خیال میں۔ جاگتے میں۔ سوتے میں۔ گارج میں۔ کھیل میں۔ کود میں۔ غرض جہاں
بھی میں ہوتی ہوں۔ موجود رہتے ہیں۔

”تو گویا وہ آپ کے ہمراز ہیں“ سلطانہ نے مسکرا کر کہا۔

اچھا بھئی اب تم بتاؤ۔ پدمنی بولی۔ تمھاری شادی کب تک ہو رہی ہے۔

ساتھ آئیں گے۔ ہے ؟

”میری شادی،“ سلطانہ نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔ کیا پوچھتی ہو بہن، غریبوں

کی شادی کا

”سٹو بھی“ بدھ سنی نے جھنجھلا کر کہا۔ ”تھاؤ نا“

کیا بتاؤں؟ سلطانہ کچھ رنجیدہ سی ہو گئی۔ کیا بتاؤں تمہیں؟

”کیا بات ہو؟“ پدر منی نے سلطانہ کی ٹھہڑی چھوتے ہوئے کہا: ”یتاؤ تو میری بہن“

”بھمن پرمی، سلطانہ نے لمبی سانس لیکر کہا۔ میری شادی ایک ایسے شخص

کے ساتھ ہونے والی ہے جس سے میں "رکتے ہوئے" وہ بولی "جس سے میں نفرت

کرتی ہوں۔“

”وہ سوا کون ہے بہن؟“ بدقسمتی نے پوچھا۔

”میرا خالہ زاد بھائی یوسف علیؒ جواب ملا۔

”تم اس سے نفرت کیوں کرتی ہو؟“ بدتمنی نے سوال کیا۔

۱۰ ایک شرابی رنڈی باز جوار سی سے تم نفرت کرو گی یا محبت ؟ سلطانہ بولی۔

”نفرت ہے پدمنی نے کہا۔ لیکن سلطانہ شادی سے تم انکار کیوں نہیں کر دیتیں سنا ہے

تمہارے والد تو بڑے آزاد خیال ہیں۔

۔۔۔ اُن کہتی ہیں کہ اگر میری شادی یوسف سے نہ کی گئی تو وہ نہ ہر کھا کر اپنا

خاتمہ کر لیں گی۔ بڑی مشکل میں جان بھنسی ہو، کیا کہوں؟

۔۔۔ یہ تو صرف اُن کی دہمکی ہے۔ بد قسمتی گردن ہلا کر بولی۔

عملی ہے۔ مگر اُن سے کچھ عجب بھی نہیں۔ سلطانہ نے موٹر سے باہر دیکھتے ہوئے

کہا۔ بد قسمتی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُسکی سانس رُک گئی۔ کیا دیکھتی ہو کہ ایک دوسری

موٹر اُسکی کار کے برابر سے چلی جا رہی ہے۔ ٹھیک اسوقت اس دوسری موٹر سے ایک

نقاب پوش بد قسمتی کے موٹر میں کودا۔ اور سلطانہ کو گردن میں اٹھا کر اپنی موٹر میں اس

بہرہ رومی سے پھینک دیا جس طرح ریلوے اسٹیشن پر قلی پارسلوں کو پھینک دیا کرتے ہیں

پھر خود اپنی موٹر میں کود پڑا۔ اور آٹافانامی میں موٹر نظروں سے غائب ہو گئی۔

بد قسمتی کی سانس نیچے کی نیچے اور اوپر کی اوپر تھی۔ اس کا دل بانسوں اچھل

رہا تھا۔

”گنگا“ بانپتے ہوئے اُس نے ڈرائیو سے پوچھا۔ یہ کون لوگ تھے؟

ڈرائیو بھی گھبرا ہوا تھا۔ وہ اپنے دل میں ”جان بھی لاکھوں پاسے“ کا

وظیفہ پڑھ رہا تھا کھانتے ہوئے بولا۔ بانی، پریشور جانے کون بد معاش تھے۔

میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ جب وہ نقاب پوش اپنی گاڑی میں کودا۔

یہ ابھی کچھ اور کہتا مگر چونک پڑا۔ ایک دوسری موٹر زن سے اُس کے

قرب سے نکل گئی اور اُسی سمت میں گئی جس میں ان بد معاشوں کی موٹر گئی تھی۔

باب

”ٹھیک اُسی وقت ایک موٹر آئی“

ٹیکسی ساتھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے سڑک پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ لیکن تب بھی اختر ڈرائیور کو کھوٹے سے دے دے کر بار بار کہہ رہا تھا: ”تیز اور تیز، رفتا تیز کر دنا“؟

الغرض ٹیکسی کی روشنی میں اختر نے اُس کار کو دیکھا جس کا وہ پہچان کر رہا تھا۔ دونوں سمندر سے پانچسوفیٹ کی بلندی پر اپنی پوری رفتار سے جا رہی تھیں۔ اختر باتھ میں سپتول لئے ہوئے (جو اُس نے آج شام کو کسی سے عار تیا لیلیا مقام سلطانہ کو بد معاشوں کے پنجے سے چھڑانے کی منکریں اس قدر غرق تھا کہ اس کو پانچسوفیٹ نیچے خوفناک سمندر کے دہشتناک منظر کی کوئی پروا نہ تھی) اگرچہ ہر سکند ہر لمحہ پر یہ خوف تھا کہ اب دونوں موٹروں میں سے ایک پانچسوفیٹ نیچے سمندر میں گرا جا رہی ہے۔

اختر بار بار کہہ رہا تھا ”تیز اور تیز کر دنا“ اور ٹیکسی ڈرائیور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

اب دونوں موٹروں میں صرف چند ہی گز کا فاصلہ ہو گا۔ نقاب پوش نے اپنی کار سے فائر کیا جو خالی گیا۔ اختر نے اس کا جواب دیا مگر یہ بھی نشانے پر نہ لگا۔ اختر کو یہ بھی خوف تھا کہ کہیں اس کی گولی بد معاش نقاب پوش

کے بدلے اس کی پیاری سلطانی کے نہ لگ جائے۔ یہ پہلا موقع تھا جو پستول اس نے ہاتھ میں لیا تھا۔ یہ سوچ کر وہ سر افاڑ کرتے ہوئے وہ جھجک اٹھا۔ ابھی وہ اسی الجھن میں تھا کہ ٹرے ایک آواز ہوئی اور اس کا ڈرائیور ایک آہ دل سوز کے ساتھ سیٹ سے دوئیٹ اچھل کر اسٹینز ہاٹ پر جھک گیا۔ ٹھیک اسی وقت ایک موٹر آیا مگر موٹر نے والا تو ختم ہو چکا تھا۔ ٹیکسی اپنی پوری رفتار کے ساتھ مع انحر اور مردہ ڈرائیور کے پانچسٹوئیٹ نیچے سمندر میں کود پڑی۔

باب

”وہ بیہوش تھی“

شہر سے تقریباً پالیس میل دور پہاڑوں سے گھرے ہوئے دہشتناک جنگل میں کچھ لوگ پتھروں پر بیٹھے ہوئے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ نقاب پوش نے نقاب اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اصغر! آج کون سا دن تھا؟“

”پیر“ اصغر نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔

”پیر“ دلاور (نقاب پوش) مسکراتے ہوئے بولا۔ اور اس وقت کیا بجایا؟

”بارہ بجنے میں تین منٹ“ اصغر نے سوکھے منہ سے جواب دیا۔

”تو نے دیکھا؟“ سوکھا سا مقدمہ لگا کر حقایق سے دیکھتے ہوئے دلاور بولا۔

دلاور جو کہتا ہے وہ کرے دکھا دیتا ہے۔ کل رات تھیسٹر میں تو میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ اب اپنی بلی جیسی آنکھوں سے دیکھ، سلطانہ کس کی گود میں ہے اُسی کا لے بعلول گی؟ اور ابھی ذرا یہ ہوش میں آجائے تو تیری ان چند ہی آنکھوں کے سامنے اس کی باہیں بھی اسی کا لے بعلول کے گلے میں ہوں گی۔ دوسرا ہتھ لگا کر اُس نے کہا: ”ہنہ“، اب تو کیوں بولنے لگا۔ دیکھی دلاور کی دلاوری۔ بول، بول، خاموش کیوں بیٹھا ہے؟

اصغر گردن جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔ اُس کے پانچوں دوست بیٹھے ہوئے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر منہس رہے تھے۔ آخر کار اصغر نے گردن اٹھائی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ابھی ٹمبا ٹھسوٹ کرا یا ہے انگریز مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا: ”دلاور واقعی تم نے بڑا کام کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میں سقد رعیت ہو۔ لیکن شاید یہ تم نے نہیں سوچا“ ذرا رکتے ہوئے وہ بولا: ”کل کیا ہوگا؟“

”کل کیا ہوگا“ دلاور نے پشیمانی پر مل ڈالتے ہوئے کہا: ”پولیس نقش کر رہی اور جان توڑ کر کرے گی کیونکہ یہ ایک مالدار کی لڑکی ہے۔ مگر جانتے نہیں میں بھی تو پولیس سے زیادہ ہوشیار ہوں۔ پولیس کے ان کتوں کو ایسے ایسے چلے دیئے ہیں کہ وہ بھی یاد ہی کرتے ہوں گے۔“

لیکن ان پانچوں میں سے ایک بولا: ”یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سمجھا کرنے والا کون شخص تھا؟“

”ہوگا کوئی پولیس کا لٹا“ لاہر واہی سے دلاور نے جواب دیا۔ خیر۔

ابتو وہ بیٹے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کی تہ میں چین کی نیند سو رہے ہوں گے۔
سلطانہ اب تک دلاؤر کی گود میں بیہوش پڑی تھی اور دلاؤر بچہ پی سے
اُس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

باب

”تم لوگ جلد محفل برخاست“

سلطانہ کا ہونیوالا شوہر یوسف علی شراب کے نشہ میں دھت حسن آرا
طوائف کے کوٹھے پر بیٹھا ہوا ناچ اور گانے کے مزے لے رہا تھا۔ حسن آرا
کھڑی ہوئی اپنی گوری گوری باہیں نچا نچا کر کوٹھے شکار ہی تھی۔ کبھی انگڑائی لکیر
اپنی مست جوانی کا اُبھار دکھا دکھا کر نیم بہ نیم چکنی چکنی رٹوں کو بل دینے لگتی۔
اور کچھ اس طرح سے اپنے سارے جسم کو ہلاتی کہ لوگوں کو پھریری سی آجاتی اور وہ
ایک سسکی لیکر رہ جاتے۔

حسن آرا نے یوسف کی طرف ایک داسے دیکھا۔ پھر انداز سے اس کو
اشارہ کر کے گانے لگی۔ ”دل یہ کہتا ہے دلربا تو ہے“ ہاں دل یہ ”۔۔۔۔۔“
”آنکھ کہتی ہے بیوفا تو ہے“ ہاں آنکھ کہتی ہے۔
”کیا خوب“ یوسف نے تالی بجا کر کہا۔ ”کیا پیاری آواز ہے۔ خدا کی قسم
کیا گلہ پایا ہے“ حسن آرا کی طرف دونوں ہاتھ پھیل کر وہ بولا۔ ”آؤ پیاری سب کو“

باب ۹

”خشکی کا میلوں پتہ نہ تھا“

جس کو خدا رکھے اُسے کون چکھے۔ اختر سیکسی سمیت پانی کی تہ میں پہونچ
چکا تھا لیکن قدرت کو تو رپا کر سمجھ دکھانا مقصود تھا۔

فقوڑی دیر بعد اختر ایک لٹھے کے سہارے ہوتا ہوا چلا جا رہا تھا اور اب
یہ لٹھا بہتا ہوا ایسی جگہ نکل آیا تھا۔ جہاں خشکی کا میلوں پتہ نہ تھا۔ اسوقت اسے
وماغ کو صرف ایک خیال پاش پاش کئے دیتا تھا اور وہ یہ اسکی پیاری محبوبہ سلطانہ
بدعاشوں کے پھندے میں ہوگی۔ گرم گرم آنسو اس کی ہرن جیسی آنکھوں سے
نکل نکل کر سمندر کے نیلے پانی میں مل رہے تھے۔ وفتاً اُسکے منہ سے نکلا۔

ابتداءً عشق ہے۔ روتا ہے کیا

اُسے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

باب ۱۰

”کایک اُس نے ڈپٹ کر کسا“

دو گھنٹے ہو گئے مگر سلطانہ اب تک ہوش میں نہیں آئی۔ ولا اور نے سہولت

سے اتار کر زمین پر ٹسا دیا۔ اور خود اٹھ کر کچھ سوچتے ہوئے ٹہلنے لگا۔ اصفہر اٹھ کر نہ معلوم کہاں چلا گیا۔ اور اس کے پانچوں دوست پیر پھیل کر خڑاٹے لینے لگے۔ سلطانہ نے آہستہ بہتہ آنکھیں کھولیں لیکن دلاور کو اپنے قریب سے گزرنا دیکھ کر پھر بند کر لیں اور جب دلاور کے جوتوں کی آواز ذرا دور سنائی دی تو اُس نے پھر ہوشیاری سے تھوڑی تھوڑی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دلاور کی پیٹھ اُس کی طرف تھی اور وہ ٹہلتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ سلطانہ نے گردن اٹھا کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ وہ پانچوں پڑے خوب زور و شور سے خڑاٹے لے رہے تھے۔ یہ آہستہ سے اٹھی اور ان سونیوالوں میں سے ایک کے قریب جا کر (جو سب زیادہ خڑاٹے لے رہا تھا) اُس کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ٹھیک اُس وقت دلاور نے پیٹھ موڑ کر اس کی طرف کیا۔ اب وہ سلطانہ کی طرف جھپٹا ہوا چلا آ رہا تھا۔ لیکن اب تک وہ سونیوال کی جیب سے پستول نکال چکی تھی جس کی نال دلاور کے دل کی سیدھ میں تھی۔

”خبردار“ ڈپٹ کر اُس نے کہا: ”ہاتھ اوپنچے کرو۔ ورنہ جان لو خاتمہ

قریب ہے۔“

اب دلاور کے دونوں ہاتھ اس کے سر سے اوپنچے تھے۔ وہ دل میں سمجھتا رہا تھا کہ اس کو اپنی گود سے اتار کر وہ کیوں ٹہلنے لگا تھا۔ وہ پانچوں گھوڑے بیچ کر اب تک پڑے سو رہے تھے۔

”خبردار“ سلطانہ نے دلاور کو گھوڑے سے ہٹے کہا۔ اگر ذرا بھی آواز نکالی تو سمجھ لے گولی تیرے سیاہ دل کے آ رہا ہو جائے گی۔ سمجھ گیا۔“

دلاور کھڑا پیشانی پر بل داسے اپنے پیچھے کے ہونٹ کو چپا رہا تھا۔ اسکی

آنکھیں نہ میں میں گڑی ہوئی تھیں۔
 یکایک سلطانہ نے ڈیٹ کر کہا۔
 ”پلو تیجھے ہو۔ اور ہو۔ سیتے جاؤ۔“
 سلطانہ کی پیٹ کے تیجھے تین فرلانگ پر آ صغربے فکری سے سیٹھی بجاتا
 ہوا چلا آ رہا تھا۔

باب

”مگر چہ چہ گز کے فاصلہ پر“
 سمندر میں تلاطم تھا۔ اختر سو سو فیٹ اونچا اٹھکر پانی کی موجوں کے
 درمیان دفن ہو جاتا تھا۔ اگرچہ اب وہ خشکی سے زیادہ دور نہ تھا۔ تاہم پانی
 کی ہر موج موت کا پیغام نظر آ رہی تھی۔ اختر حسرت سے آسمان کی طرف
 نظر اٹھاتا مگر ہر لمحہ چرخ اس غریب کی طرف لا پورا ہی سے دھیکر مسکرا
 دیتا۔ اس وقت بھی سلطانہ اس سے دور نہ تھی۔ جب خوفناک موج اسکو
 آسمان کی طرف لیجاتی تو اختر ہر ستارے میں اپنی محبوبہ کو روتے ہوئے پاتا۔ یہ
 اُس سے رونے کا سبب پوچھتا۔ وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتی۔
 ”پیائے اختر۔ کیا پوچھتے ہو، بد معاش میری عزت کے تیجھے پڑے ہیں۔ آہ۔ تم
 اپنی جان میرے لئے مفت میں کیوں دے رہے ہو۔ جاؤ۔ جاؤ۔ دیکھو تمہاری

مصیبت زدہ بوڑھی ماں جس کے گھر کا اُجالا۔ جسکی زندگی کا سہارا۔ جس کی آنکھوں
کا تارا۔ جس کی خوشی صرف تم ہو۔ تمھارے لئے اپنی جان رو کر ہلکان کیے دے
رہی ہے۔ جاؤ پیارے اختر جاؤ۔ اس غریب کی تمناؤں کا خون نہ کرو۔ بڑھاپے
میں اس کے غمزدہ دل کو شیشے کی طرح پتھر پر نہ مارو۔ ابھی تمھاری شادی ہونا
سچی۔ تمھیں نوشہ بنا کر اس کے مردہ دل میں نئی زندگی اس کی بوڑھی روح میں
تازگی پیدا ہوگی۔ جاؤ پیارے اختر جاؤ۔ اپنی قیمتی جوان جان سلطانہ کے لئے
یوں برباد نہ کرو۔ جاؤ پیارے اختر جاؤ۔

اختر کی آنکھیں آنسوؤں کا دریا بہا بہا کر سمندر کے موج کو سہ چند کر رہی تھیں۔
یکایک ایک یو کی آواز کے ساتھ ایک بڑی لہریں اسکو خشکی پر پھینک دیا۔ اس کا
سر ایک بڑی چٹان سے ٹکرایا اور خون جاری ہو گیا۔

یہ وہ مقام تھا جہاں ایک بڑی ندی سمندر میں آکر گری تھی۔ اکثر
یورپین شکاری اس ندی میں مگر کا شکار کھیلنے آیا کرتے تھے۔
اختر خشکی پر جس دحرکت پڑا تھا اور ایک مگر چھ چند گز کے فاصلہ پر لپچائی
ہوئی نظروں سے اسے دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولانہ سماتا تھا۔

باب ۱۲

”سب جاگ بڑے“

صفر کج تخیل میں غرق سیٹی بجاتا ہوا خراماں خراماں چلا آیا تھا۔ یکایک

اُس کی نظر سلطانہ کی پشت پر پڑی۔ دیکھتا کیا ہے کہ سامنے اس کا دوست دلاور سے
 اونچے ہاتھ کیے رونی صورت بنائے بیچھے ہلتا چلا جا رہا ہے۔ اصغر وہیں ٹھٹھک گیا۔
 مسکراہٹ کی ایک لہر اس کے ہونٹوں پر دوڑ گئی اور اب راستہ کاٹ کر یہ سلطانہ
 کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

”بیگم، اصغر نے تنظیم سے سر جھکا کر کہا: مجھے حضور کا خادم سمجھئے۔ میں سرکار
 کو اس بد معاش کے پھندے سے نکلنے کی انتہائی کوشش کروں گا۔“
 رد وھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ سلطانہ نے دونوں پر نظر رکھتے ہوئے کہا۔
 ”تم بھی اسی کے ساتھی ہو۔ بھلا اس وقت کئی رات کو تمہارا ایسے کھنے خونا
 جنگل میں ہونا کیا معنی ہے؟“

”بیشک، میں اسی کا ساتھی ہوں۔“ اصغر سچ بول دیا۔ مگر حضور آپ کے یہاں
 لانے میں نے ہرگز اسکا ساتھ نہیں دیا ہے۔ قصہ یہ ہوا کہ ”.....“
 ”بس، سلطانہ پستول ہلاتے ہوئے یولی: تم میرا خیال بٹانے کی کوشش
 نہ کرو۔ میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔“
 ”بیگم، اصغر نے یقین لانے کی کوشش کی، خدا کو اہ ہے۔ میں آپ کو
 دھوکہ نہیں دے رہا ہوں۔ میں آپ کو اس شیطان سے: اس نے دلاور کی طرف
 اشارہ کرتے ہوئے کہا: اس شیطان سے بچانے کی کوشش کرو رہا ہوں۔ جلدی کیجیے
 خدا کو اسے بیگم جلدی کیجئے۔ ورنہ اگر کہیں ان بد معاشوں میں سے کسی ایک کی بھی
 آنکھ کھل گئی تو مشکل ہو جائے گی۔ پھر آپ کا خدا ہی حافظ ہے بیگم، مجھے اپنی جلد سے
 حرکت کرنے کی اجازت دیجئے تاکہ میں اس بد معاش کو رسی سے کس لوں اور اُن

پانچوں کے پستول نکال کر اُن کو بھی باندھنے کی کوشش کروں۔ مجھے ایک تھوڑا سا لالچ ضرور ہے۔ وہ یہ کہ آپ کے والد سیٹھ محمود بھائی سے تھوڑی سی رقم الغام کے طور پر حاصل کر سکوں گا۔

اصغر کے الفاظ میں سچائی کی جھلک تھی۔ سلطانہ کو اگرچہ اس کی ان باتوں پر پورا یقین نہ تھا تاہم اس نے اصغر سے اپنی شیریں آواز میں کہا۔
 ”راجھا اپنا کام انجام دو۔ کیونکہ بیپاری غریب لڑکی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کا دل اس کی پسلیوں سے ٹکرا رہا تھا۔ اور وہ دل ہی دل میں اپنے پروردگار سے نہ جانے کیا کیا دعائیں مانگ رہی تھی۔

یون سلطانہ کی اجازت حاصل کر کے اصغر ٹہلتا ہوا دلاور کے پاس پہنچا اور تپکھے سے اُس کے نوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالتے ہوئے مسکرا کر آہستہ سے کہنے لگا۔
 ”ہاں تو اس اٹھتی کونسل کی باہیں کاے بجلوں کے گلے میں ہیں نا؟“
 دلاور کا دل جل بھن کر کباب ہو گیا۔ مگر پستول کی نال اپنی طرف دیکھ کر وہ خاموش ہی رہا۔

پھر اصغر مسکراتا ہوا اُن پانچوں کے قریب گیا اور اُن میں سے چار کے پستول اپنے قبضے میں کئے۔ کیونکہ اُن میں سے ایک کا پستول تو سلطانہ پہلے ہی اسکی جیب سے نکال چکی تھی۔

ابنہ دو بد معاشوں کو اٹھفیس کی لمبی گہریوں سے باندھ کر تیسرے کی پگڑی اُتار رہا تھا کہ اُن دو بندھے ہوؤں میں سے ایک کی آنکھ کھل گئی اور وہ اس زور سے چلایا کہ سب جاگ پڑے اور اب تو اصغر کی گردن ان میں سے ایک کے ہاتھ میں

تھی۔ اُدھر سلطانہ دلاور کو ایک سکند کے لئے بھول کر ان بد معاشوں کی طرف متوجہ ہوئی
تھی کہ چشم زدن میں سپتول اس کے ہاتھ سے غائب ہو کر دلاور کے ہاتھ میں تھا۔

باب ۱۳

”وہ خوشی سے اُچھل پڑا“

صبح صادق تھی جنگل میں کیسا بھلا معلوم ہو رہا تھا نسیم سحری انگلیلیاں کرتی
پھر یہی تھی ریتہ ریتہ تبیح میں مصروف تھا۔ مرغان چمن و جد میں گرنے لیت اپنی
شیریں آواز میں خدائے بزرگ و برتر کی شان میں الپا رہے تھے۔
کچھ آدم خود بہ ہنہ حبشی آپس میں ہنستے ہنساتے اپنی خاص قسم کی کلھاڑیاں
بھوٹے موٹے درختوں پر مارتے۔ سمندر کی طرف سے بے ڈھنگے انداز سے اُچلتے کودتے
چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً ایک حبشی ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی سرخ سرخ آنکھیں سمندر
کے کنارے کسی خاص چیز کو گھور رہی تھیں۔ اب وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ انگلی سے
اشارہ کرتے ہوئے اس نے اپنے ساتھیوں سے اپنی زبان میں آنکھیں کھاڑ کر بڑے بڑے
سفید دانت نکالتے ہوئے کچھ کہا اُس کے ساتھیوں نے بھی اس شے کو دیکھنے کے ساتھ ہی
خوش ہو کر آنکھیں کھاڑ کر اپنی اپنی بتیسی نکال دی۔ پھر اُن حبشیوں کا سردار
مسکراتا ہوا چند قدم آگے بڑھا اور اپنی کمر پٹی میں سے ایک عجیب قسم کی ٹیڑھی ہیری
نکال کر نشانہ لیتے ہوئے سمندر کے کنارے اس زور سے پھینکی کہ مگر مجھ (جو اب بہوش آتر کے

بالکل قریب آچکا تھا اور اس کی ران پر منہ مارنا ہی چاہتا تھا، کے پیٹ کے آریار ہو گئی۔ گردن موڑ کر جشیوں کو دیکھتے ہوئے انکا سردار اس انداز سے مسکرایا گویا اپنے اچھے نشانے کی داد چاہتا ہے۔

غرض آدم خور جشیوں نے تالیوں سے داد دی۔ پھر لپک کر اختر تک گئے اور اسکو سر سے اوستیا اٹھا کر خوشی کے گیت گانے لگے۔ سردار نے سمندر کے کنارے ہاتھ جوڑ کر پانی کے دیوتا کا شکریہ ادا کیا۔ کیونکہ آج دس برس کے بعد آدمی کا لذیذ گوشت وہ مزے لے لیکر کھائیں گے۔ اب وہ اپنی گرخت آواز میں خوشی کا گیت گاتے ہوئے۔ اختر کو سر سے اوستیا اٹھاتے ہوئے آپس میں انگلیلیاں کرتے ہوئے کودتے پھانڈتے گھنے جنگل میں چلے جا رہے تھے۔

باب

”وہ بیوش بنی پڑی مٹی“

صبح کے چھ بج رہے تھے۔ یوسف علی حسن آراطوالف کے گھر میں پڑا خروٹے لے رہا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پچھلے دنوں سے بیمار ہے۔ زرد زرد تپتے کھلے آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے۔ بقول شخصے صورت پہ ڈھانی بیج ہے تھے۔ وہ منہ کھولے ہوئے موقوفوں کی طرح سو رہا تھا کہ حسن آرا نے آکر اسکے

ٹھٹھے ہوئے منہ میں سپرینٹ کی دو گولیاں ڈال دیں۔ غرپ غرپ کر کے وہ نکل گیا۔
اور پھر آؤ آنکھیں پھاڑ دیں۔

”راٹھتے نہیں پیلے،“ طوائف نے انداز سے کہا۔ ”تم نے آج مجھے شکار کو
لیجانے کا وعدہ کیا ہے۔ اٹھو اٹھو، اُس نے یوسف کو گدگداتے ہوئے کہا۔ منہ
باتھ دھو کر ناشتہ کر لو۔“ یوسف کی پشیمانی کو چومتے ہوئے وہ بولی۔ اور پھر ہنس شکار
کو لیچلو۔ یہ کلمہ حسن آرانے اپنا سر یوسف کے سینے پر رکھ دیا۔

”ہاں ہاں میری جان“ یوسف نے اپنی دلربا کے گداز شانے پر باتھ پھرتے ہوئے
کہا۔ ”چلو کتنا شکار کھیلو گی۔“

”جتنا کھلاؤ گے“ طوائف نے اٹھلا کر کہا۔ ”چلو اٹھو نا۔“

الغرض کانکتے ہوئے یوسف صاحب اٹھ بیٹھے۔ اور منہ باتھ دھو کر اپنی محبوبہ
کے ساتھ ناشتہ کرنے بیٹھ گئے۔

”دیکھو جی، حسن آرانے اپنی سرنگیں آنکھیں چلا کر ناز سے مسکرا کر کہا۔

”آج ہم تم سے خفا ہو جائیں گے۔“

”کیوں کیوں؟“ چائے کا گھونٹ لیکر پیالی نشتری میں کھتے ہوئے

یوسف بولا۔ آخر وجہ۔ ارے جب تم ہی ہم سے خفا ہو جاؤ گی سرکار۔ ہنستے ہوئے

اُس نے کہا۔ ”تو پھر ہمارا بیٹھا ہی کون ہے۔ کس کے لئے ہم جہیں گے۔“

”اچھا تو طوائف نے زمین کو کھودتے ہوئے کہا۔ مجھے ایک اچھی سی ساڑھی

لا کے دو۔“

”بس“ یوسف ہنس کر بولا۔ اتنی سی بات۔ اچی ایک کیا جتنی کہو جانم۔

آخر ہمارے والد صاحب قبلہ کس کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ اُس نے حسن آرا کے گلے میں ہاتھ
ڈالتے ہوئے کہا۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ تمہارا ہی تو ہے۔ میری کامنی۔۔۔ مگر
حسن آرا کے ہاتھ سے پورا کا پورا اُبلّا ہوا انڈا منہ میں لٹکیر چلیے ہوئے وہ بولا
۔۔۔ آج تو شکار کو چل رہی ہو۔ کل۔۔۔

۔۔۔ کل دل نہیں لئے مجھے تو آج ہی لا کے دو۔ طوائف نے اٹھلا کر کہا۔ بند قتب
وغیرہ لینے پھر جاؤ گے۔ بازار سے ہماری چیز بھی لیتے آنا۔ یہ کہہ کر اُس نے یوسف کے
شانے پر سر رکھ دیا اور ٹکٹکی باندھ کر اُس کے چہرے کو تکیے لگی اور بولی۔ تو کس قدر
حسین ہے میری جان۔ تجھ پر سے میں قربان۔ آہ۔ ایک ٹھنڈی سانس لیکر اُس نے
آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ہوش کی گود میں ہوش بنی پڑی تھی۔ اور رندوں
کی چال کو نہ سمجھنے والا بو قوف یوسف حسن آرا کے سر کو اپنے زانو پر رکھے ہوئے اس کے
منہ پر پانی کے چھنٹے دے دے کر اپنے قیص کے دامن سے ہوا کر رہا تھا۔ دوسرے
کمرے میں حسن آرا کی ماں ان دونوں کا یہ تماشہ دیکھ دیکھ کر اپنی چھوٹی بیٹی دل آ رام
کی طرف مڑ مڑ کر مسکراتے ہوئے یہ گارہی تھی۔

بہا محبت کو گھر ہوش میں لانا ہو
زانو پہ لٹا لینا دامن سے ہوا کرنا

باب ۱۵

”اس کا پھل بچھے اچھا نہ ملیگا“

اصغر ایک پرانے بڑے درخت میں اُلٹا لٹکا ہوا تھا اور اس کے نیچے زمین پر آگ سُلگ رہی تھی۔ دلاور اور اُس کے ساتھی اُس کے آس پاس کھڑے قہقہے لگاتے تھے۔ سلطانہ کھنوں میں سر دیئے بیٹھی ہوئی زار و قطار رو رہی تھی۔ کیونکہ نازک نے قت آپہنچا تھا۔ اور اب اُس کی عزت کے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

ٹھٹھا مار کر بیچارے اُلٹے لٹکے ہوئے اصغر کو اپنی شیشم کی لکڑی سے ٹھونسہ دیتے ہوئے دلاور نے کہا: ”کیئے اصغر صاحب۔ مزاج اقدس۔ اجی آپ تو سلطانہ کو دلاور کے پھندے سے نکال کر محمود سیدٹھ سے انعام حاصل کیجئے۔“ قہقہہ لگا کر وہ اُنکلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا: ”مگر ذرا جناب اس دوزخ کی چنگاری سے بھی تو اچھ لیجئے۔“ ہا ہا ہا ہا۔۔۔

پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا: ”چلو اور اس کمبخت کو“ اپنی لکڑی سے غریب اصغر کو پھر ٹھونسہ دیتے ہوئے اُس نے کہا: ”اس جھگل بیابان میں جل کر خاک ہو جانے کے لیے چھوڑ دو۔“

یہ کہہ کر اُس نے سلطانہ کو گود میں اٹھا لیا۔ اور اصغر کو اُس کے حال پر چھوڑ کر لمبی لمبی دکیں مارتا ہوا آگے بڑھا۔ پیچھے پیچھے اس کے ساتھی

قہقہے لگاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔
 دور سے پلٹ کر دلاور نے اصغر کی طرف دیکھا اور ٹھٹھا مار کر چلاتے ہوئے
 کہا: "خدا حافظ مسٹر اصغر خدا حافظ۔"
 "میں تو جل کر خاک ہو جاؤں گا۔" اصغر نے غصے سے چلا کر کہا۔ مگر یاد رکھو
 دلاور، اس کا پھل تجھے اچھا نہ ملے گا۔
 دلاور نے جواب میں ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور گنجان جنگل میں معہ سلطانہ
 اور اپنے ساتھیوں کے غائب ہو گیا۔

باب ۱۶

"تیری محبت میں جان دیدی"

پھونس کی چند جھونپڑیوں کے سامنے آدم خور حبشی ٹھہرا بنائے ہوئے
 ناچنے گانے کو دے اُٹھنے غرض اسی طرح خوشیاں منانے میں مشغول تھے۔ سامنے
 بتھروں پر رکھے ہوئے ایک بڑے کڑھواؤ میں تیل کڑکڑا رہا تھا۔ اور قریب ہی
 دو حبشیوں کے سیاہ مضبوط بازوؤں میں اختر جگڑا ہوا کھڑکڑا رہا تھا۔ وہ حسرت
 سے آسمان کی طرف نظر اٹھائے پروردگار عالم سے اپنے گناہوں کی معافی
 مانگ رہا تھا۔

یہ ایک اُس کی آنکھوں کے سامنے اس کی بوڑھی ماں کھڑی ہوئی روی

تھی۔ بیٹے، کیا اسی دن کیلئے میں نے تجھے فاقے کو کر کے۔ سلاٹیاں سی سی کر مصیبتیں
 جھیل جھیل کر پالا تھا کہ آج تو اس منحوس کو ہاؤ میں کباب ہو کر ان کسمپخت
 وحشیوں کے پیٹ میں لقمہ بن کر اتر جائے۔ بیٹے۔ پیارے بیٹے۔ مجھے چھوڑ کر
 نہ جا۔ تیری بوڑھی ماں تیرے بعد کیسے جئے گی۔ بیٹے میرے بیٹے۔ او میرے اختر
 اپنی بوڑھی ماں پر رحم کھا۔ اللہ میں کیا کروں۔ ۔۔ آہ۔ ۔۔ او خدا
 مجھے موت دیدے۔ اُس نے دیوانوں کی طرح ہاتھ پھیلا کر چلے تے ہوئے
 کہا۔ او وحشیو، میرے نخت جگر کو چھوڑ دو۔ ہاں۔ ہاں۔ میں تیار ہوں۔ آؤ
 آؤ مجھے۔ ۔۔ مجھے اس کو کڑا تے تیل میں ڈال دو۔
 ایک دم سے اُس کی بوڑھی ماں اس کی نظروں سے غائب ہو گئی۔ اختر
 کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ٹپ ٹپ دو آنسو اس کی خوبصورت آنکھوں سے
 گرے اور اُس کے دل فریب رخساروں پر سے ہوتے ہوئے سٹی میں مل گئے۔
 اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ باد صبا اُس کی پیشانی کو چوم رہی تھی۔ لسنے
 باد صبا کو مخاطب کر کے کہا۔
 ”اے نسیم سحری مجھ سے اٹھیلیاں نہ کر۔ جا۔ میرے معشوق کو پیغام دے
 اس سے کہنا۔ اختر نے تیری محبت میں جان دیدی۔ اگرچہ اُسے پسند نہ آئے
 ہو گی۔ کیونکہ اُسے آج تک میرے عشق کی خبر نہیں۔ تاہم اے پیاری نسیم تو اُسے
 کسی نہ کسی طرح یقین دلادینا اور یہی کہنا۔ اختر تیرا سچا ۔۔ ۔۔ آہ،
 سچا عاشق تھا۔ مگر بھٹہ۔ ممکن ہے محبت میں میرے مرنے کا حال سن کر اسکو
 کوئی صدمہ ہو سچے۔ اس کی پریشانیوں میں اضافہ ہو جائے۔ اسلئے دیکھ

اے باد صبا دیکھ۔ ایک لفظ بھی میری پریشانیوں کا اپنی زبان پر نہ لانا۔ ہاں صرف
آنا کہنا۔ اختر تیرا سچا عاشق تھا۔

باب

”میں اماں کو بلاتی ہوں“

یوسف اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا بند و قفس وغیرہ نوکر کو موٹر میں لکھنے کے واسطے
دے رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔

”کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔

ایک شیریں آواز ”میں آسکتی ہوں“

یوسف یہ ہاں ہاں آجاؤ۔

دروازہ کھلا اور اس کی بڑی بہن زہرہ داخل ہوئی۔ یہ اس وقت گلابی

رنگ کی ساری میں بھلی معلوم ہو رہی معلوم ہو رہی تھی۔

زہرہ ”کیسے ہو یوسف؟“

یوسف ”گھبرا کر“ اچھا ہوں۔ کیوں؟“

زہرہ ”مسکرا کر“ رات کہاں تھے؟“

یوسف (بات بناتے ہوئے) میں ذرا ” ” ” اپنے ایک دوست کے

یہاں تھا۔ یونہی۔ دعوت وغیرہ تھی۔ (زمین کو دیکھتے ہوئے) ذرا دیر ہو گئی تو

یوسف۔ (آنکھیں ملنے ہوئے) شکار کو جا رہا ہوں۔ (نوکر سے) اسے بھی سب سامان رکھ دیا۔

نوکر۔ جی ہاں حضور۔ بس یہ بسترہ گیا ہے۔

انغرض بستر بھی رکھ دیا اور مسٹر یوسف اپنی کار میں بھیج کر بازار سے پانچ سو روپے کی بھاری ساڑی خریدتے ہوئے حسن آرا کے گھر پہنچے اور ساڑی پیش کرتے ہوئے بولے۔ یہ لیجئے حضور آپ کی چیر۔

پھر کیا تھا یوسف کے گلے میں حسن آرا کی گوری گوری باہیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ لہک کر گارہی تھی۔

آئی جان میں جان آپ کے آجانے سے
اسکو کب سے نہ مطلب ہے نہ تہانے سے
گھٹ گئی شرم مرے شوق کے بڑھ جانے سے
حسن کی شان فزوں ہوتی ہے شرنانے سے

دم لبوں پر تھا دل زار کے گھبرانے سے
تیرا کوچہ نہ چھٹے گا تیرے دیوانے سے
جہاں بلب بچکے سینے سے لگا یا اُس نے
دوئی عشق بڑھا دیتی ہے بیابانی دل
یوسف۔ اچھا اب چلتی ہویا نہیں۔

حسن آرا۔ کہاں؟

یوسف۔ بڑی جلدی بھول گئیں۔ شکار میں چل رہی تھیں نا۔
حسن آرا۔ (یوسف کو پیار کرتے ہوئے) جانی اب تمہیں ہواؤ۔ پھر کبھی چلی چلوں گی
تمہارے ساتھ شکار میں۔ بات یہ ہے کہ مجھے دعوت ہیں جانا ہے۔ ادھر تم گھر کے
ادھر شری کے یہاں سے اذن آیا۔

یوسف۔ واہ یہ اچھی رہی۔ خود ہی تم نے عند کی تھی اور خود ہی پھسل گئیں۔

تھاری جہ سے تو میں جا رہا تھا۔ میں کچھ نہیں جانتا اب تو تمہیں چلنا پڑے گا۔ دعوت کی
ایسی قیسی۔

حسن آرا دیوسف کے کتے پر اپنا کتا رکھ کر دہاتے ہوئے، من جاؤ پیارے۔ آپس
داری کا معاملہ ہے۔ بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ تم ہو آؤ۔ ہاں بڑے
اچھے ہو تم تو۔

یوسفؑ تو پھر میں بھی نہیں جاتا۔ میں تو صرف تمہیں شکار کھلانے لے جا رہا تھا
حسن آرا داٹھلا کر تمہیں میری جان کی قسم۔ میرا مردہ دیکھو جو شکار کو اسی وقت
نہ جاؤ۔ اور ہاں سنو۔ اماں کو بھی لیتے جاؤ۔ ان بیجاری نے آج تک
جنگل ہی نہیں دیکھا۔

یوسفؑ دہنسل کر یہ ایک ہی رہی۔ اماں کو لیتے جاؤ۔ آاں کو لے جا کر لیا
کروں گا؟

حسن آرا یہ نہیں میری خاطر سے پیارے۔ دیکھو میں تم کو اپنی جان کی قسم دھپکی
ہوں۔ ٹھہرو۔ میں اماں کو بلاتی ہوں۔

الغرض مسٹر یوسف کو اپنی چھٹی حسن آرا کی خاطر شکار میں جانا پڑا اور
ساتھ ہی اس کی ماں کو بھی لے جانا پڑا۔

بات

”وہ چلائی۔ میری آبرو۔ میری عزت“

سیکڑوں دلفریب رنگ کے ننھے ننھے بھونوں سے بھری ہوئی دادی

میں ہرے نخل جیسے فرش پر دلاور سلطانہ کو گود میں لیے بیٹھا تھا اور وہ سجاری ہاتھ پر مار کر اس کی گود سے اُترنے کی فضول کوشش کر رہی تھی۔ اس پاس وہ پانچوں بد معاش بیٹھے ان دونوں کا تاشا دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

دلاور کہہ رہا تھا۔ لڑکی دیکھ۔ سیدھی طرح نہ منے گی تو پھر۔ تو پھر۔ آنکھیں نکالے ہوئے اس نے کہا۔ پھر جبر کرنا پڑے گا۔
 ”مجھے پھوڑ دو“ (روئے ہوئے سلطانہ بولی۔) مجھے جانے دو۔ خدا کے واسطے

مجھ پر رحم کر دو۔
 گھبراتی کیوں ہے؟ دلاور نے آنکھ مار کر اپنے دوستوں کو ٹل جانے کا اشارہ کیا۔ گھبراتی کیوں ہے۔ پھوڑ دوں گا۔ جانے دوں گا۔ ذرا ٹھہر کے۔
 ”اد ظالم، سلطانہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ جان لے لے پر آبرو نہ لے لے دابے ہ پانچوں نظروں سے غائب ہو چکے تھے۔

”جان لیکر کیا کروں گا؟“ ہنس کر دلاور بولا۔ اچھا لاؤ حسن کا صدقہ ایک سیٹا گرم گرم۔۔۔۔۔

”الٹ ہ بد معاش کیمنے“ سلطانہ نے اپنی مسٹی اس زور سے اس کے بڑے بڑے دانتوں پر ماری کہ مسٹر دلاور کا ایک بڑا بد نما دانت شہید ہو گیا اور سلطانہ کے نازک ہاتھ سے خون بہ نکلا۔

اُٹ کر کے دلاور نے اپنا منہ پکڑ لیا اور سلطانہ نے موقع پا کر بھاگنا چاہا۔ لیکن فوراً دلاور نے اپنے مضبوط بازوؤں کی آہنی گرفت میں لیا اس کے منہ پر رکھ دیا۔

وہ آسمان کی طرف دیکھ کر کہہ رہی تھی۔ اے خدا رحیم۔۔۔ اور رحیم

وہ پہلائی میری عزت۔۔۔ میری عزت۔۔۔

بے بس خاموشی دلا دینے ڈانٹ کر کہا۔ کیسی عزت اور کہاں کی عزت
 وہ اپنا سینہ پھٹا کر بولا۔ اگر خدا بھی آجائے تو اس وقت تو نہیں چھوٹ سکتی۔ اور خدا
 سلطانہ زور سے چلائی۔ دلا دینے زور کا قہقہہ لگایا۔ روئی کے گالے چپ رہے۔
 اُس کشتی میں اور چھپا ہے تیرا جسم۔ یہ تیری سڈول رانیں۔ یہ اُبھرا ہوا سینہ۔
 مست جوانی۔ ظالم ذرا تو سیدھی رہے۔

اور خدا۔ وہ بے بسی کے عالم میں چلائی۔

بے بس۔ دلا اور سلطانہ کے ہاتھ پیر اپنے قبضے میں کرتے ہوئے بولا۔ بس۔
 خاموشی۔ رحیم اور پروردگار۔ میری آبرو۔ سلطانہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ قریب تھا
 کہ اس کی موتی جیسی آب اُتر جائے۔ کہ یکایک دلا دینے ایک پیچ ماری اور اب
 وہ زمین پر پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔ ایک تیرا اس کے بازو کے آ رہا تھا سلطانہ
 نے آسمان کی طرف دیکھا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور اسکی آنکھوں میں
 دو تازے آنسو تھے۔ ابھی وہ اپنے خالق کا شکر ادا کر رہی تھی کہ چونک پڑی۔ کیا
 دیکھتی ہے کہ چار کونے جیسے کالے برہنہ آدمی کہاں کہاں ہاتھ میں لئے عجیب قسم کے ڈھول
 گردلوں میں ڈالے اس کی طرف دوڑتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کا دل ابا نسو
 اُچھلنے لگا۔ وہ چاروں آدم غور حبشی اپنے شکار پر جھک پڑے۔ تیر دلاؤ کے
 بازو سے نکال کر اس کو سر سے اونچا اُچھالا پھرا سے زمین پر ٹپک کر اُس کے
 آس پاس ناچنے لگے۔ دلا اور رحیم ہوش سا تھا۔ ان وحشیوں نے اپنے اس شکار کو

دیکھ کر اس قسم کی برکتیں کرنا شروع کیں گویا وہ اُسے بھون بھون کر کھار رہے تھے۔
 سلطانہ یہ دیکھ کر سمجھ گئی کہ یہ لوگ آدم خور ہیں۔ وہ ڈر کر بھاگی مگر پکڑی گئی۔
 اور اب یہ چاروں آدم خور حبشی اپنے دونوں شکاروں کو سر سے اونچا اچھا لٹے
 ہوئے خوش خوش کو دتے پھاندتے گاتے بجاتے اپنے گھر کی طرف چلے جا رہے تھے۔

باب ۱۹

”آہ“

بڑے درخت کے نیچے آگ کے خوفناک شعلے اُٹھ اُٹھ کر اصغر کے منہ کو قہقہے
 بے تھتے اور بیچارہ اصغر اُلٹا لٹکا ہوا تکلیف سے چلا رہا تھا۔ دلاور کے تھمتے
 اب تک اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اور وہ اپنے دل میں پیچ و تاب
 کھار رہا تھا۔ کاش وہ اسوقت اس بے بسی کے عالم میں نہ ہوتا۔ تو دلاور کو اسکا
 مزہ اچھی طرح چکھانا۔ مگر افسوس چند لمحوں کے بعد وہ دوسری دنیا میں ہو گا۔
 وہ خوشی سے جانے کو تیار تھا مگر دلاور سے بدلہ لینے کے بعد۔ میرے چھوٹے چھوٹے
 بچے ہیں انھیں کون پالے گا؟ یہ خیال آتے ہی وہ رو دیا۔ نہیں۔۔۔ وہ تو ہے
 وہ تو ہے مائے دلالت

آگ کی ہر لپٹ کے ساتھ ”آہ“ اسکے منہ سے نکل رہی تھی۔ جوں جوں
 شعلے بڑھتے جا رہے تھے دوں دوں اصغر کو موت قریب ہی دکھائی دے رہی تھی۔

باب ۲

”آگ“

گنجان جنگل کی سرسبز گھاس پر دو ایک بیل گاڑی چر چر چوں چر چوں
کرتی چلی جا رہی تھی۔ یوسف ہاتھ میں بندوق لئے حسن آرا کی ماں کو دجو
گاڑی کے دیچکوں سے پریشان ہو رہی تھی، سامنے وارے دیختوں کے نام تہا رہا تھا
گاڑی بان بیٹھا بار بار غریب بیلوں کی پیٹھ میں ”آر چھا چھا کر“ چل بیٹھا چل چہ چل
کی رٹ لگا رہا تھا۔ یکایک نرائن (گاڑی بان) کے منہ سے نکلا ”آگ“

”ہیں“ چونک کر یوسف نے کہا ”کہاں کہاں؟“

”جھورہ“ سامنے ناک کی سیدھ میں ”نرائن“ آگ سے

اشارہ کرتے ہوئے کہا ”وہ بڑے پٹر میں“

”ہاں ہاں“ یوسف دیکھتے ہوئے بولا ”مگر یہ آوا کیسی؟ سننا ہو؟“

”ہاں جھورہ“ نرائن نے غور سے سننے کی کوشش کرتے ہوئے بھاڑ سا منہ

کھول دیا ”کوئی ہائے ہائے کرے ہے“

”ذرا جلدی بڑھا“ یوسف نے نرائن کو ٹھونسہ دیتے ہوئے کہا ”دیکھیں

تو سہی“

”ہوسرکار“ نرائن کے منہ سے نکلا اور اپنے بیل کی پیٹھ میں آرچھا کر

”چل“ کہتے ہوئے اس نے بائیں بیل کے گوطے پر ٹکڑی جمائی۔ بیل بچا رہے

اپنی پوری رفتار سے بھانگنے لگے۔

الغرض گاڑی بڑکے درخت کے قریب پہنچی۔ یوسف کی آنکھیں بھیٹی
کی بھیٹی رہ گئیں جب اس نے ایک شخص کو اٹھائے ہوئے آگ کی سُرخی سُرخی
لبٹوں میں تڑپتے دیکھا۔ اصغر کی آنکھیں بند تھیں درود بھری آہ، اُس کے
منہ سے نکل رہی تھی۔ نرائن سے نہ رہا گیا۔ گاڑی سے کود کر چشم زدن میں
وہ بڑکے درخت پر چڑھا ہوا اسی بلکہ اصغر کو اوپر کھینچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد
اصغر جس کا سارا منہ بھلا ہوا تھا چلتی ہوئی بیل گاڑی میں پڑا کانٹے ہوئے
یوسف سے کہہ رہا تھا: ”آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گا۔ آپ کے میری جان“
یہ کہہ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اب وہ بیہوش تھا۔
اس سے پہلے یوسف اس کی آواز کبھی سن چکا تھا وہ سوچ رہا تھا۔
”یہ اُس بد معاش رفیق کی ٹولی کا تو نہیں ہے وہی رفیق جس نے ایک دفعہ
دو سو روپے لیکر شریف گھرانے کی ایک کنواری لڑکی مجھے لاکے دی تھی۔“

باب ۲

”بس بس خدا کیلئے۔“

اب وقت آچکا تھا کہ آخر کڑھاؤ کے کڑکڑاتے تیل میں ڈال دیا جائے برہنہ
جستی عورتیں ناز و انداز کے ساتھ اختر پر پھول برسا رہی تھیں۔ یہ اُن کے یہاں

کی دھم تھی۔ آخر سر جھپکا نے آنکھیں بند کئے خدا سے لو لگائے کھڑا تھا کہ کیا کبھی
کے سردار کے لڑکے نے اسے سر سے اونچا اٹھا لیا۔ اور سارا جنگل تالیوں
سے گونج اٹھا۔ اب سردار کا بیٹا اختر کو سر سے اونچا اٹھائے ہوئے کھڑا دیکھ کر
بڑھا۔ پھر کھڑکے قریب پہنچ کر اپنی زبان میں کچھ بڑھا اور اب اختر کو اچھاں کر
چاہتا تھا کہ کھڑکے لڑکے تیل میں پھینک دے کہ وقتاً اُس کے باپ کی آواز اُس کے کان
میں آئی۔ شاید اُس آواز میں سناوی تھی بھی تو سردار کا لڑکا فوراً کھڑکے پاس
اُس نے دیکھا کیا دیکھتا ہے کہ اس کا باپ ہاتھ میں کمان لیے گلے میں ڈھول
ڈالے پیٹھ پر ایک خوبصورت لڑکی کو لاوے کھڑا ہے۔ اور اُس کے پیچھے تین ساتھی ایک
موتے تازے بدھورت انسان کو سر سے اونچا اچھاں رہے ہیں۔ سردار نے اپنے بیٹے
اپنی زبان میں کچھ کہا جس کا مطلب شاید یہ تھا کہ جس کو تو اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ
بولا ہے۔ اس موتے تازے شخص کا گشت زیادہ لذیذ ہو گا۔ اس کو تیل میں ڈال۔
کیونکہ سردار کے لڑکے نے فوراً ہی اختر کو زمین پر ٹپکٹ یا۔ اور اُس کی جگہ مسٹرولاد
کو ہرنبہ کر کے سر سے اونچا اٹھا لیا۔

سلطانہ نے زلادر کے کوٹ میں (جو زمین پر اس کے پیر کے قریب پڑا تھا) ہاتھ
ڈالا کہ اسکا پستول نکال کر ان آدم خوروں سے چھپا چھڑا سکے بکر پستول کے بجائے
اُس کے ہاتھ میں چھ موٹیوں کا بار تھا۔ جو اس کی سالگرہ پر اسے سیٹھ محمود نے دیا تھا۔
سلطانہ نے اپنے دل میں کہا: تو یہ کارستانی بھی ان ہی کی تھی: ہاں! فرض ہار اُسے
اپنے سینے میں چھپا لیا۔
اتنے میں حبشیوں کی ایک اور ٹولی آتے دکھائی دی۔ یہ بھی ایک موتے

تارے آدمی کو اُچھال اُچھال کر نعرے لگاتے چلے آ رہے تھے۔ یہ شخص دلاور کے پانچ
بد معاش دوستوں میں سے ایک تھا جس کو ان حبشیوں نے جنگل میں کہیں پکڑ لیا
تھا۔

کسی کے گراہنے کی آواز آئی۔ یکایک سلطانہ کی نظر اس دُبلے پتلے آدمی پر
پڑی جس کو پہلے کڑواؤ میں ڈالنے کے لئے اٹھایا گیا تھا۔
”ہیں اختر“ اس کے منہ سے نکلا۔

اتنا وہ کہنے پائی تھی کہ ایک کرہیہ المنظر حبشی نے اسے گود میں اٹھا لیا اور
قریب کی ایک جھوپڑی میں لیجا کر بند کر دیا۔ دوست بعد جھوپڑی کا دروازہ کھلا
اور وہی حبشی اختر کو اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوا۔ بیہوش اختر کو زمین پر
چھک کر اور سلطانہ کی طرف دھکیلا اس نے ایک خوفناک قسم لگایا۔ یکایک
جھوپڑی کے باہر حبشی زور سے چلائے جیسے اُن کا مرغوب ترین گھانا ایک کمر تیار
ہو گیا ہو۔

جھوپڑی والا حبشی بھی خوشی سے اُچھل پڑا اور جلدی سے جھوپڑی سے
نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

”یہ اختر کہاں کیسے آ پونچے“ سلطانہ سوچ رہی تھی۔ یہ جنگل میں کیا لینے
گئے تھے جو حبشیوں نے انہیں بھی پکڑ لیا۔ بہر حال اختر کی موجودگی سے سلطانہ
کی کچھ دُعاؤں سے بندھ گئی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اختر بچا رہا خود ہی مصیبت
میں پھنسا ہے وہ اس کی کیا بددکر سکے گا۔

حبشی نے اختر کو زمین پر اس بری طرح پھینکا تھا کہ اُس کا ایک ہاتھ

کمر کے نیچے دب کر رہ گیا تھا۔

”بیچارہ خستہ“ سلطانہ کی زبان سے نکلا اور وہ اُس کے قریب ٹھیکر

کمر کے نیچے اختر کا دبا ہوا ہاتھ نکالنے لگی۔

اختر نے آنکھیں پٹیائیں۔ ”... میں کہاں ہوں۔ تم کون ہو؟“

سلطانہ ”اختر صاحب آپ مجھے نہیں پہچانتے؟“

اختر۔ ”آنکھیں مچاڑ کر، کون؟ تم... تم...“

سلطانہ ”ہاں۔ میں۔ میں ہوں آپ کی کلاس فیلو سلطانہ“

اختر کا کچھ دماغ ٹھکانے ہوا لیکن اپنی محبوبہ کو اپنے قریب کھینچ کر عجیب کیفیت

سی اسپرطاری تھی۔ وہ ٹٹکی باندھ کر سلطانہ کو دیکھ رہا تھا اور سلطانہ کو ایسا معلوم

ہو رہا تھا۔ جیسے اختر باگل ہو گیا ہو۔ ایک منٹ تک وہ خاموش رہا۔ بلکہ بول

کیسے کہ بول ہی نہ سکا۔ پھر اس کے خوبصورت رخساروں پر دو آنسو بہ نکلے۔

”اچھی تو ہیں آپ“ اختر کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

سلطانہ۔ ”خدا کا شکر ہے لیکن آپ یہاں کہاں؟“

اختر کے دل نے کہا ”آہ“ ”اب تک اسکو یہ بھی پتہ نہیں کہ اختر کے یہاں ہونے

کا سبب کیا ہے“ وہ نہ جانے کیا کیا سوچنے لگا۔

سلطانہ ”ہاں تو آپ یہاں کیسے آئے اختر صاحب؟“

اختر ”دمکرا نے کی کوشش کرتے ہوئے، جیسے آپ یہاں تشریف لے آئیں“

سلطانہ ”(آنسو پونچھ کر) مجھے تو یہ کیسے وحشی اٹھائے؟“

اختر ”مجھے بھی یہی وحشی اٹھائے؟“

سلطانہ: ”کہاں سے؟“

اختر: ”کہیں سمندر کے قریب سے۔ اور آپ کو؟“

سلطانہ: ”مجھے تو ان کمبختوں نے ایک بیابان جنگل میں پکڑ لیا تھا لیکن آپ اس

ویرانے میں سمندر کے کنارے۔۔۔۔۔؟“

اختر: ”اور آپ بیابان جنگل میں کیسی؟“

سلطانہ (گردن جھکا کر زمین کو دیکھتے ہوئے): ”مجھے تو وہ نقاب پوش اٹھالایا تھا

بدمنی کی کار سے۔“

اختر: ”اور میں اُس نقاب پوش کا پیچھا کر رہا تھا۔“

سلطانہ: ”آپ پیچھا کر رہے تھے۔ کس طرح؟“

اختر: ”موٹر سے۔“

سلطانہ (کچھ سوچ کر): ”پھر کیا ہوا؟“

(چونکہ اس وقت دلاور سلطانہ کو بہوشی دے چکا تھا اس لئے اس غریب لڑکی

کو یہ تک نہیں معلوم تھا کہ کسی نے اس کا پیچھا بھی کیا تھا۔)

الغرض اختر نے اسے بتایا کہ کس طرح اس کی موٹر پانی میں گر گئی اور کیسے

خدا نے اُسے بچا لیا۔ سلطانہ کے پوچھنے پر اختر نے یہ بھی بتا دیا کہ کس طرح ان

بدعاشوں کی اسکیم ٹھیکڑ میں بنی تھی اور چونکہ اس کو پورا یقین نہ تھا کہ وہ واقعی

ایسا کر گزریں گے اس لئے اُس نے سلطانہ کو بلاوجہ نہرو دار کر کے پریشانی میں

ڈالنا نہ چاہا۔ لیکن احتیاطاً اپنے دوست افضل حسین سے پستول لیکر رکھ لیا تھا

ڈرامہ ختم ہونے پر جب وہ گھر کی طرف جا رہا تھا تو اُس نے ان محفیضروالے بدعاشوں

کو ایک موٹر میں جاتے دیکھا۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا: آج دیکھنا دلاوری کی
دلاوری ہے اختر چونک پڑا اور ٹیکسی کر کے اُدھر روانہ ہو گیا۔ جدھر ان بدعاشوں
کی موٹر گئی تھی۔

اسکے بعد سلطانہ نے بھی اپنا سارا قصہ سنایا۔ اختر غور سے سن رہا تھا
دلاوری پر اس بوبے اسنا غصہ چلا آ رہا تھا اگر اس وقت اس کے سامنے دلاوری ہوتا
تو نہ جانے یہ کیا کر دیتا۔ مگر دلاوری اب کہاں ؟
دفتر سلطانہ نے بڑا پیڑھا سوال کیا۔

”کیا میں بوجھ سکتی ہوں اختر صاحب۔ آپ نے اپنی جان کیوں خطرے
میں ڈالی میرے لیے یوں؟“

اختر کو ایک دھکا سا لگا۔ اس سوال کے جواب میں اُس کی آنکھیں
آنسوؤں کا سینہ پر سائے لگیں۔ بڑی مشکل سے وہ اتنا کہہ سکا۔

”مدیوں ہی۔ جی چاہا تھا بس“
سلطانہ (آنکھیں کھلا کر) آپ رہنے لگے۔ یہ کیوں؟
اختر کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھتے
ہوئے وہ بولا: ”کچھ نہیں“

سلطانہ: ”کچھ تو؟“

اختر: ”کچھ بھی نہیں“

سلطانہ (سرد آہ بھر کر): ”یہ سب تکلیفیں آپ کو میری وجہ سے پہنچی ہیں“
اختر: ”آپ کی وجہ سے۔؟ نہیں۔ میری قسمت ہی میں ازل سے تکلیفیں ہیں۔“

یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بچپن میں والد کا انتقال ہو گیا۔ مصیبتیں جھیل جھیل کر سو رہا ہوں۔ پالا۔ کالج میں داخل ہوا تھا کہ ..

کاش کہ میں کالج میں داخل ہی نہ ہوتا۔ (وہ کچھ سوچنے لگا)

سلطانہ: کالج میں داخل ہونے سے کیا ہوا۔ شاید آپ کا مطلب یہ ہے کہ نہ کالج میں داخل ہوتے اور نہ آج اس مصیبت میں پھنستے۔

اختر: (جھجھلا کر) اُف .. شاید آپ سمجھتی ہیں۔ میں مرنے سے ڈرتا ہوں۔

سلطانہ (مسکرا کر) تو پھر آخر کیا بات ہے۔ کچھ تو کہئے۔

اختر: کیا کہوں۔ مجھ سے نہیں کہا جاتا۔ میں نے کئی بار کوشش کی لیکن راسکی

سانس پھول گئی۔ ہاتھ پر ٹھنڈے ہونے لگے۔

سلطانہ (اختر کو گھورتے ہوئے) آپ کو کہنا پڑے گا۔

اختر: (دکھتے ہوئے) مجھے ایک .. کچھ بھی نہیں۔

سلطانہ: ارے، ارے، کیسے۔

اختر: کیا کہوں۔ کوئی بات بھی ہے۔

سلطانہ: کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ اختر صاحب، آپ مجھے اپنا راز دلا

نہیں بنانا چاہتے تو جانے دیجئے۔ (بھولے پن سے) سنئے اب یہ جیشی ہم لوگوں

کو کھا جائیں گے کیا؟

اختر نے سلطانہ کو غور سے دیکھا۔ پھر آنکھیں بند کر کے خبر نہیں کہاں

پہنچ گیا۔

سلطانہ: سچ بتائیے اختر صاحب۔ یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ دیکھئے تو آپ مجھے

اپنا راز دار بنانا نہیں چاہتے۔ میں میں بے غیرت ہنر ہر سے پوچھ رہی ہوں۔

اختر: آپ کو نہیں پتہ؟

سلطانہ: کاش ہے کا؟

اختر: اچھا سنئے، میں آپ کو اپنا راز دار بناتا ہوں۔

سلطانہ: (مسکرا کر) شکریہ۔

اختر: (دہمت کر کے) میں کچھ .. دیوانہ سا ہوتا ہا رہا ہوں۔

سلطانہ: (ہنس کر) کہے جایئے۔

اختر: آپ تو مجھ پر ہنستی ہیں۔ جانے دیجئے۔

سلطانہ: نہیں نہیں۔ کیئے۔ اب نہیں ہنسوں گی۔

اختر: میں کچھ سوچتا رہتا ہوں ہر وقت؟

سلطانہ: کیا؟

اختر: میرے دل میں ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ آہ۔

سلطانہ: یہ کیوں؟

اختر: وہ میرے دل میں سما چکی ہے۔

سلطانہ: کون؟

اختر: وہ میری روح کی گہرائیوں میں اتر چکی ہے۔

سلطانہ: کون ہے وہ؟

اختر: میں اس سے چاہتا ہوں۔ اس سے محبت کرتا ہوں لیکن ..

سلطانہ: یہ آپ کس کو چاہتے ہیں۔ آپ کس سے ..

اختر .. لیکن .. لیکن وہ یہ بھی نہیں جانتی۔ یہ بھی نہیں جانتی کہ میرے
یہاں بیونے کا سبب کیا ہے ؟
سلطانہ کے ہاتھ پر کانپ رہے تھے وہ دل میں کہہ رہی تھی : ”اختر کو
مجھ سے محبت ہے۔“

اختر : ”وہ نہیں جانتی۔ وہ کچھ نہیں جانتی۔ وہ میرا مذاق اڑاتی ہے۔ وہ
مجھے دیوانہ سمجھتی ہے۔ وہ پتھر ہے۔ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہر اسکا دل۔“
سلطانہ : ”بس بس۔ خدا کے لیے۔“

(اُس نے اختر کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر زور سے دبا یا
اور روتے ہوئے اختر کی طرف دیکھ کر کہا : ”اختر :“

اختر کی آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹوں میں جنبش تھی۔ ہاتھ پیروں میں
لرزہ تھا۔ یکایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر دوڑ گئی۔ کانپتی ہوئی
آواز اُس کے منہ سے نکلی : ”سلطانہ“

باب ۲۲

بیچاری مجبور ہو گئی : ”

شام کا وقت تھا۔ آفتاب دن بھر کی کڑی ٹہنی منسلط کرنے کے بعد دریا کے آئینہ
پر بازس پھیرتا ہوا مغرب کے پہاڑوں میں نئی دامن کی طرح منہ چھپا رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی

ہوا چل رہی تھی۔ درختوں پر چڑیاں چوں چوں چوں کر کے بسیرہ لینے کی فکر میں
تھیں۔ دریا کے کنارے ایک خیمہ لگا ہوا تھا۔ خیمے کے باہر یوسف کھڑا ہوا ایک ہرن
کو جس کو ابھی ابھی شکار کر کے لایا تھا۔ گاڑی بان سے اُدھر وارہا تھا اور حسن آرا کی
مان خیمے کے دروازے پر کھڑی ہوئی ہرن کی اُدھرنے کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔

خیمے کے اندر اصغر چار بائی پر پڑا تھا۔ کراہتے کراہتے ابھی ابھی اس کی آنکھ لٹک
گئی تھی۔ ابھی تک یوسف سے اس کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ اصغر
کو اُن سے بچانے کے بعد یوسف اسے خیمے میں نیم بہوش چھوڑ کر پھر فوراً شکار کو چلا گیا تھا
اور دن بھر کے بعد ابھی ابھی واپس آیا تھا۔ اصغر نے سوچا تھا کہ جب یوسف شکار سے
آجائے گا تو سلطانہ کا قصہ اس سے بیان کرے گا۔ وہ جانتا تھا کہ یوسف سلطانہ کا لون
ہے۔ سننے ہی آگ بگولہ ہو جائے گا اور دلاور کو ایسی سرد دلوائے گا کہ وہ جھڑا بھی
ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہی سوچتے سوچتے وہ سو گیا تھا۔ اسے کیا خبر کہ اس کی یہ دہتان
اُن کی رہ جائے گی۔

خیمے کے باہر یوسف زور سے بولا۔ "مجھے تو اس کالے ہرن کا افسوس ہے۔
میں نے گناہ اُسی کے چاہا تھا لیکن کجبت اس کی آڑ میں ہو گیا۔ قصاً تو اسکی تھی۔
حسن آرا کی ماں: "اس وقت حسن آرا ہوئی تو کیسی خوش ہوتی۔"
یوسف: "وہ بھی عجیب ہیں۔ کتنا کہا چلو۔"

حسن آرا کی ماں: "کیا کرتی۔ مجبوری تھی۔ آپس داری کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور
ہمارے یہاں تو خصوصاً بڑے جھگڑے ہوتے ہیں۔ اسلئے بیچاری مجبور ہو گئی۔ وہ نہ
تھاری بات وہ ٹالتی۔ تم پر تو اس لوند باکی جان جاتی ہے۔ نہ جانے تم نے کیا کر دیا۔"

سمجھے کہ دنیا میں حسن آرا سے بڑھ کر ان کا چاہنے والا کوئی نہیں۔ پس کیا تھا فوراً ہاتھ دھو کر
میں گیا اور سو روپیے کا نوٹ نکل آیا۔

”لو میری جان“ سیٹھ جی اپنی توند ہلا کر بولے۔ ابھی تو یہ سیٹھ سیٹھائی دکھائی

کھانا۔ رات کو میں آؤں گا تو تمہیں بھی طرح خوش کر کے جاؤں گا۔

اس کی کیا ضرورت تھی۔ نوٹ لیتے ہوئے حسن آرا نے مسکرا کر کہا: ”شکریہ“

”اچھا، اب میں جاتا ہوں،“ سیٹھ جی نے حسن آرا کو بھینچ کر پیار کرتے ہوئے کہا

”ایک ضروری کام ہے۔ رات کو آؤں گا۔“

”ضرور آئیے گا۔“ طوائف نے سیٹھ ہزاری لال کے گلے میں باہیں ڈال کر

کہا: ”میں آپ کا انتظار کروں گی ایسا نہ ہو کہ..... دیکھئے ضرور آئیے گا۔“

الغرض سیٹھ جی رات کو آنے کا پکا وعدہ کر کے خوش خوش طوائف کے کوٹھے

سے نیچے اتر گئے۔

باب ۲۴

”اے تم یہاں کہاں سو وقت“

رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ آدھم خورشیدی دس برس کے بعد اپنی مرغوب ہنر

کے کباب کھا کر خوشیاں مناتے مناتے ٹاڑی کے نشے میں دھست گھوڑے بیچ کر سو گئے

تھے۔ بکڑی کے پھرے کے قریب (جس میں خیرا و سلطانہ کو بھوپڑی سے نکالنے کے بعد بند

کر دیا گیا تھا، دو قومی الجتہ انسان پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ سلطانہ پنجرے میں اختر کے قریب بیٹھی کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔ اختر اپنی معشوقہ کی قربت سے ہنسنے خوش تھا کہ اُسے حبشیوں کے کڑھاؤ کا ذرا بھی ڈر نہ تھا۔

”اب کل اپنی باری ہے“ آخر کار سلطانہ نے کہا۔ کیا رہائی کی کوئی حدت

نہیں ہے؟

”سلطانہ“ مسکراتے ہوئے اختر بولا۔ ”گھبرانے سے کیا فائدہ۔ خدا پر بھروسہ

رکھو۔ جو قسمت میں لکھا ہے۔ ہو کے رہے گا۔ موت سے کیا ڈر۔ وہ تو ایک شان آنا ہی ہے۔ دیکھو آج یہ لوگ میرا گوشت کھانے والے تھے لیکن تم جانتی ہو کس کا گوشت کھا پاؤ گے؟ یہ کیا تھا۔ آج میری موت نہیں آتی تھی۔ پھر مجھے کون مار سکتا تھا۔ لیکن کل اگر موت کا دن مقرر ہے تو کوئی اُسے نہیں ٹال سکتا۔ ہم کو خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا چاہیے جو اسکی خوشی ہے۔

”اختر اور سلطانہ کے ہاتھ دعا کیلئے اٹھ گئے۔“

اتنے میں پنجرے کے قریب سونے والے دو حبشیوں میں سے ایک نے ایک خاص قسم کی آواز کے ساتھ کڑواہٹ بدلی۔ اور اپنی کلہاڑی کو جو اس کے پیر کے قریب تھی۔ ایک ایسی لات ماری کہ وہ پنجرے کے بالکل قریب جا پڑی تھی اور اختر نے ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے اُسے اٹھالیا۔ اب وہ سلطانہ کی طرف دیکھ کر سکر رہا تھا۔ پھر نظر اٹھا کر اُس نے پنجرے کے باہر دیکھا۔ دونوں حبشی بڑے بوئے زور زور سے خراٹے لے رہے تھے۔ الغرض اُس نے پنجرے کی تکراری کو کلہاڑی سے آہستہ آہستہ کاٹنا شروع کیا۔ کھٹے کھٹے زور رک جاتا تھا یہ دیکھنے کیلئے کہ

کہ کھاڑی کی آواز سے جیشیوں کی نیند پر کوئی اثر تو نہیں پڑتا ہے۔ لیکن سرخ
سرخ آنکھوں والے گارے انسان اس قدر تھک گئے تھے کہ اگر ان کے سر پر توپیا
بھی چلتیں تو ان کو خبر نہ ہوتی۔

غرض آدھ گھنٹے بعد پنجرہ کا اتنا حصہ کٹ گیا کہ ایک آدمی بخوبی بھگستا
تھا۔ اختر پہلے خود باہر آیا۔ پھر سلطانہ کو نکالا۔ اور اب یہ دونوں آہستہ آہستہ
دبے پاؤں سونے والے جیشیوں کے قریب سے ہو کر چلے جا رہے تھے کہ ایک
جیشی نے زور سے کھانسا۔ سلطانہ کا دل بلیوں اچھلنے لگا اور وہ محسوس کر گئی
ہو گئی۔ ہاتھ بکڑ کھینچتے ہوئے اختر نے دبی زبان سے کہا۔ اب چلی بھی آؤ۔
انقصہ تھی دیر بعد جنگل بیابان میں دونوں مصیبت زدہ عاشق
و عاشق ہانپتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اور نیلے آسمان کے ستارے ان کی
رہنمائی کر رہے تھے۔

یکایک ایک آہ کے ساتھ سلطانہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اور اختر کو ایسا
معلوم ہوا گویا ایک تیراس کے دل کے آ رہا ہے۔ اب وہ جھکا ہوا سلطانہ
کے پیروں کاٹا نکال رہا تھا۔ کانٹا تو نکل گیا مگر تکلیف سے پاؤں زمین پر
نہیں رکھا جاتا تھا اس لیے اختر نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ پیچھے پلٹ کر دیکھا
اور اپنی پوری رفتار سے دوڑنے لگا۔ دو سیار بول رہے تھے
قریب کی جھاڑی میں شیر گرج رہا تھا۔ سلطانہ شیر کی آواز سے ڈر ڈر کر
اختر سے چٹ چٹ جاتی تھی۔ اور اختر اس کو سمجھانا ہوا دوڑتا چلا جا رہا
تھا کہ یکایک ٹھوکر لگی اور وہ مع سلطانہ کے دھڑکتے گھر پڑا۔ اُس کے مٹھن

سے خون بھل رہا تھا سلطانہ کا ہاتھ پھل گیا تھا۔ اختر نے جلدی سے اپنے قمیص میں سے ایک چندی بھاڑ کر اپنے لب میں تر کی اور سلطانہ کے چہلے ہوئے ہاتھ پر باندھی۔ دفعتاً دو آدم خوروں کے چلانے کی آواز سنائی دی۔ اختر نے فوراً ہی سلطانہ کو گود میں اٹھا لیا۔ اور بھاگنے لگا لیکن حبشیوں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔

اختر بجا رہی طرح ہانپ رہا تھا اور چند گز کے فاصلہ پر حبشی اسکے پیچھے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ اختر سمجھ رہا تھا کہ اب ان شیطانوں سے بچنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اسے اپنی جان کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ سو غرا۔ مرتبہ وہ کڑھاؤ کے کڑکڑاتے تیل میں کباب ہو کر ان موذیوں کے پیٹ میں اتر جانے کو تیار تھا بشرطیکہ حبشی اس کی دلوں کو چھوڑ دیں تاکہ وہ آرام سے اپنے گھر میں نرم نرم بچھونے پر بیٹھی نیند سو سکے۔ لیکن یہ سب کچھ ناممکن تھا۔

اب وہ دریائے کنارے دوڑ رہا تھا۔ اور آدم خوروں کی سانس کی آواز اس کے کان میں آرہی تھی۔ دفعتاً اس کی نظر ایک سفید خیمے پر پڑی جو دریائے کنارے سو قدم کے فاصلہ پر لگا ہوا تھا۔

اب وہ مدد مدد جلاتا ہوا خیمے کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا اور قریب تھا کہ حبشی اس کی گردن پر اپنا لوبہ جسیا ہاتھ مارے کہ ٹھیک اس وقت ایک شخص خیمے سے نکلا اور اس نے پستول کی نال آسمان کی طرف کر کے فائر کیا تاکہ ظالم ڈر کر منظر کو چھوڑ دے۔ اور یہی ہوا۔ پستول کی آواز سن کر حبشی

۹۲
اٹے پیروں بھاگے۔ یوسف نے دو تین فائر اور کئے تاکہ وہ لوگ پھر آنے کا قصد کرنے کی ہمت نہ کریں۔

آخر نے جواب تک یوسف کے قریب آ گیا تھا ہاں بیٹے ہوئے یوسف کا شکریہ ادا کیا اور سلطانہ کو گود سے اُٹا رہا۔

موم بتی (جو خیمے میں دروازے کے سامنے تھی) کی روشنی یوسف کے آدھے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

داندہ تشریف لیجئے: ”یوسف نے گردن ہلا کر کہا۔ اور موم بتی کی روشنی اس کے پورے چہرے پر پڑی۔

سلطانہ: ”(پچانتے ہوئے) ارے یوسف بھائی ہیں؟“
یوسف: ”(آنکھیں کھپا کر) کون؟“
سلطانہ: ”میں ہوں سلطانہ۔“

یوسف: ”سلطانہ؟“ ارے تم یہاں کہاں اسوقت۔ اچھا آؤ۔ اندر آ جاؤ۔“
یہ کہہ کر وہ خیمے میں داخل ہوا۔ اور اس کے پیچھے سلطانہ اور اختر اندر پہنچے۔

باب ۲۵

”وہ مرغ بیل کی طرح تڑپا ہا تھا“

نیچے کے اندر کونوں میں تین چار پائیاں پڑی تھیں جنہیں سے ایک پر
صغیر اور دوسری پر حسن آرا کی ماں پڑی سو یہی تھی۔ دروازے کے سامنے
میر پر موم بتی کے پاس مچاٹ پر اس شراب کی دو بوتلیں اور کٹ گلاس
کا جام رکھا ہوا تھا۔ میر کے قریب ایک آرام کرسی۔ بیت کی دو کرسیاں۔ اور
ایک اسٹول پڑا ہوا تھا۔ ایک طرف کونے میں دو ڈرنک رکھے ہوئے تھے۔

خود آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے اور اُن دونوں کو بیت کی کرسیوں
پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے یوسف نے کہا: "ہاں تو سلطانہ یہ قصہ کیا ہے؟"
تم کل رات سے کہاں غائب تھیں؟ اور یہ کون گویں تھا رہا سچھا کر رہے تھے؟
اور آپ اختر کی طرف اشارہ کر کے اُس نے پوچھا: "آپ کون ہیں؟"
سلطانہ (اختر کی طرف اشارہ کر کے) آپ میرے گلاس فیلو مسٹر اختر ہیں۔ (یوسف
کی طرف اشارہ کر کے) اور آپ میرے خالہ زاد بھائی مسٹر یوسف؟

اختر نے یوسف کی طرف مسکرا کر ہاتھ بڑھایا لیکن اس طرح مال گیا جیسے
کوئی بات ہی نہ تھی۔ اور بچارے اختر کو کھسیانا ہونا پڑا۔

سلطانہ: "اکھنوں نے مجھ کو کافی مدد دی۔ اگر یہ نہ ہوتے تو میں کل تک ان آدم خور
جیشیوں کے منہ کا لوالہ ہو جاتی جو ابھی ابھی ہمارا سچھا کر رہے تھے۔ قصہ یہ ہوا
یوسف بھائی... .. (اس کے بعد وہ اپنی داستان بیان کرنے لگی)
یوسف غور سے سن رہا تھا اور کین انکھیوں سے اختر کو دیکھتا جاتا تھا۔

الغرض جب سلطانہ اپنی مام کہانی ختم کر چکی تو یوسف نے اپنے نیچے کاٹھ
چبا کر زمین کو دیکھتے ہوئے کہا: "لیکن... .. کیا میں پوچھ سکتا ہوں اختر صاحب

یہ آپ کو کیا پڑی تھی جو بلا وجہ جناب نے اپنی جان مصیبت میں ڈالی؟
اختر (کچھ ٹک کر) آپ جانتے ہیں سلطانہ میری کلاس فیلو ہیں۔
یوسف (سوکھا سا قہقہہ لگا کر) درست ہے۔ کلاس فیلو کے لئے اتنی بڑی
شرابی۔ سچ بتائیے۔

اختر۔ (دھنک کر) گویا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔
یوسف (دھنک کر جام میں شراب اُٹھیلے ہوئے) مجھے تو بھی دال میں کچھ
کالا کالا نظر آتا ہے۔ (مقوڑی سی پی کر) کیوں سلطانہ؟
سلطانہ۔ یوسف بھائی آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔
یوسف (جام دوبارہ بھرتے ہوئے) تو میری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں تمہارے
اور آئیں بھی کیسے؟ (معنی خیر نگاہیں سلطانہ پر ڈالتے ہوئے) ساری باتیں تو
اختر صاحب سمجھا چکے ہیں تمہیں۔

سلطانہ۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟
یوسف۔ (تیسرا جام بھر کر) تم دونوں نے مجھے بھولا سمجھ رکھا ہے۔ میں نے
ایسے کہیں بہت کیلے ہیں۔ یہ سن گھڑت ہیاں نہیں چلے گی۔ کہو تو صاف کہو
(سرخ سرخ آنکھیں نکال کر) بتا دوں اصل قصہ کیا ہے؟ یہ اختر صاحب
تمہارے کون ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔

اختر کے چہرے پر خون تیزی سے دوڑ رہا تھا اور سلطانہ کی سانس کی
رفتار تیز تھی۔

یوسف (دھنک کر) مجھے سب معلوم ہے۔ تم دونوں کل رات سے فرار ہو کس لئے؟

یہ بھی میں جانتا ہوں تاکہ جنگل میں سفیری سے جوانی کے مزے اڑا سکو مگر بد قسمتی
سے دوسری مصیبتیں۔۔۔۔۔

سلطانہ (چلا کر) بس خاموش۔۔

اختر۔۔ یوسف صاحب، آپ کو شرم نہیں آتی۔ اپنی بہن کے متعلق ایسے لفاظی
یوسف۔۔ ایسی سچی بات کہیں کو کیا نہ کہوں۔

اختر۔۔ بغیر جانے بونچھے کسی پر الزام رکھ دینا اچھا نہیں۔ آپ نے عصمت کی دیوی
کو عیب لگایا۔ اور مجھے بد معاش ٹھہرایا۔

یوسف۔۔ بد معاش نہیں تو آپ کون ہیں؟

اختر۔۔ (آنکھیں نکال کر) حضرت میں آپ کے پھر عرض کروں گا زبان سبٹھالیے۔

یوسف۔۔ آنکھیں کھانے کی کوشش نہ فرمائیے۔ چوری اور سینہ زوری۔

اختر۔۔ میں عرض کر رہا ہوں۔ مجھ میں بے برداشت نہیں ہو۔ ہماری جان بچا کر
اگر آپ ہمارے محسن نہ بن گئے ہوتے۔ تو۔۔۔۔۔

یوسف۔۔ ہاں، ہاں کہئے۔۔۔۔۔ تو آپ مجھے جان سے مار دیتے۔۔۔

بد معاش کہیں کے۔۔۔۔۔ سورا۔۔

اختر (کھڑے ہوئے) کیا کہا؟

پستول اٹھا کر فائر کرتے ہوئے یوسف بولا۔۔ یہ کہا؟

ایک آج سوز کے ساتھ اختر زمین پر ڈرہا۔ اور سلطانہ اس پر چھکی

ہوئی۔ وہی ہی تھی۔

یوسف (دانت پیکی) میں نہ کہتا تھا کہ یہ تیرا عاشق ہے کیسی چھپ گئی

اپنے بارے۔ چل الگ ہٹے۔

اصغر اور حسن آرا کی ماں پستول کی آواز سے جاگ اٹھے تھے اور
آنکھیں جھپاڑے ہوئے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔

”کیا قصہ ہے؟“ اصغر نے دسیمی آواز سے پوچھا۔

یوسف (پستول ہلاتے ہوئے) کچھ نہیں۔ تم لوگ سو جاؤ۔ تمہیں اس قصے
سے کوئی مطلب نہیں۔“

حسن آرا کی ماں نے جلدی سے اپنا منہ رضائی سے ڈھک لیا۔ اور
مصنوعی خراٹے لینے لگی۔ اصغر نے بھی پستول کی مال اپنی دیکھ کر ادھی ادھی
آنکھیں بند کر لیں۔

”نرائن“ یوسف نے گاڑی بان کو آواز دی۔ ”اے او! لوگ بچھے۔“

نرائن۔ کہاں مر گیا بخت۔ یہ کہہ کر وہ خیمے سے باہر نکل گیا۔

اختر زین پر مرغا بسمل کی طرح ٹپ رہا تھا۔ اور سلطانہ کے گرم گرم
آنسو اس کی پیشانی پر گہرے ہوئے تھے۔

یوسف خیمے میں داخل ہوا۔ اسکے پیچھے نرائن آنکھیں ملتا ہوا چلا

آ رہا تھا۔

یوسف ”نرائن۔ اس مرد کو اٹھا اور دریا میں پھینک دے۔“

سلطانہ ”دگر گڑے ہوئے“ نہیں نہیں یوسف بھائی۔ دیکھئے گولی ران میں لگی ہو

اسے مردہ سمجھ کر پانی میں نہ پھینکے۔“

یوسف پیر (کھڑی انگلی پوٹوٹوں پر رکھ کر) چپا۔

سلطانہ ”جھنجھٹے۔ (اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہ رہا تھا)

نرائن ”(ایک آنکھ ملے ہوئے) دیا کر و مجھو، اس سچا رسے کو کاہے پانی میں ڈالو ہو“
یوسف ”چپ گدھے کے بچے۔ بس تجھ سے جو کہا ہے کرے۔“

نرائن ”(ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے) ہو سرکار۔ جو حکم۔“

یوسف (سلطانہ کا ہاتھ پکڑ کر) مٹتی ہے یا نہ مجھے بھی پھکڑا دوں پانی میں؟
یوسف نے سلطانہ کو کھینچ کر اختر سے الگ کیا۔ سلطانہ نے حسرت سے اختر
کی طرف دیکھا۔

گراہتے ہوئے اختر نے کہا۔

”سلطانہ بھراؤ نہیں۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔“

الغرض نرائن نے اختر کو تیشی سے کس لیا اور اس کے منہ پر پٹی باندھنے کے بعد
اسے اٹھا کر خیمے کے باہر لے گیا۔

باب ۲۶

”تینوں ل کے ٹوئیں جوانی کے مزے“

سلطانہ روتے روتے بیہوش سی ہو گئی تھی جبھی تو یوسف اُسکے منہ پر پانی کے
پھینے دے رہا تھا جس نے آراکی ماں رضائی میں دبی ہوئی بناؤنی خراٹے سے رہی تھی
اصغر خاموش پڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

الغرض سلطانہ نے آنکھیں کھولیں اور پہلا لفظ جو اس کے منہ سے نکلا وہ
"ختم ہوا تھا۔"

یوسف (غصے سے) پھر وہی آخر۔ تیرا داغ ٹھیک نہیں ہوا اب تک۔
سلطانہ: "اختر کو اپنے کہاں بھیج دیا۔ سچ بتائیے۔"
یوسف (سلطانہ کو ٹھوکر مار کر جہنم میں):

سلطانہ: "خدا کی واسطے بتائیے۔"

یوسف (جام میں شراب اُٹھاتے ہوئے) میں کہتا ہوں اختر کو مہول جادو یوانی کیا
دنیا میں ایک وہی لہر و جہاں ہے۔

سلطانہ (آنکھیں بند کر کے) وہ نہ جانے کہاں ہوگا۔

یوسف (بھل کر) دیا کی تہ میں۔ اگر اب کی اپنے پار کا نام لیا تو اچھا نہ ہوگا۔ سمجھیں،
(دوسرا جام بھرتے ہوئے) دیکھ کیسا پیارا رنگ ہے۔ تھوڑی سی پی اور پھر میرے ساتھ
جوانی کے مزے اُڑا۔ تو بھی کیا یاد کر گئی۔ (دھجوتے ہوئے) اُس اُلٹے کے پٹھے اختر کو
نہ مہول جائے تو میرا نام یوسف نہیں۔ ہاں یوسف نہیں۔۔۔۔۔ یوسف نہیں۔
پھر لیا۔۔۔۔۔ پھر کیا۔۔۔۔۔ پھر بھی نہیں۔ یوسف نہیں۔ چھوڑ۔

سلطانہ (آنکھیں نکال کر) ہوش میں آئیے یوسف بھائی۔ آپ کو شرم نہیں آتی ہیں
سے ایسی ہیودہ گفتگو۔

یوسف (لوٹ کھڑے ہوئے) کیسی ہیں۔۔۔۔۔ (جام سلطانہ کی طرف بڑھا کر آلے
چلو تو سہی۔۔۔۔۔ ذرا سی۔۔۔۔۔ یس ذرا سی۔

سلطانہ (حقارت سے) میں اس سے اور اس کے پینے والے دونوں سے نفرت کرتی ہوں۔

ان سستی بھری آنکھوں میں آنسو۔

سلطانہ (اپنا سر زور زور سے ہلاتے ہوئے) چھوڑ۔ مجھے چھوڑ دے کجخت۔
یوسف (فقہہ لگا کر) ابھی سے — ابھی تو میں نہیں چھوڑوں گا تجھے۔ تو بھی جوان

میں بھی جوان۔۔۔۔۔ اور یہ۔۔۔۔۔ بابا۔۔۔۔۔ چار پائی بھی۔

جواں۔۔۔۔۔ تینوں ملے۔۔۔۔۔ لو میں

جوانی کے مزے۔۔۔۔۔ بابا بابا۔

اصغر سے نہ رہا گیا آہستہ سے اٹھا اور میز پر پڑا ہوا پستول اٹھا کر

نال یوسف کی طرف کرتے ہوئے ڈپٹ کر بولا۔ خبردار۔

یوسف نے پلٹ کر دیکھا اور فوراً سلطانہ کو چھوڑ دیا۔ اب وہ

ہاتھ اٹھائے سہما کھڑا تھا۔

اصغر، بلیک صاحبہ، وہ بلس سے بندھی ہوئی رسی کھول لائے۔ جائے جائے

جلدی کیجئے۔

انقرض جلدی سے سلطانہ رسی کھول کر لائی اور بھولے پن سے

اصغر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اسے کیا کروں؟

اصغر، یوسف کی طرف دیکھ کر پستول ہلاتے ہوئے ہاتھ پیچھے کر دے۔

یوسف نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

اصغر، (مسکرا کر) بلیک صاحبہ۔ اب آپ ایسا کیجئے۔ اس مرد کے پیچھے جا کر

اس کے دونوں ہاتھ خوب کسکر باندھ دیجئے۔

(یوسف کو دیکھ کر) جناب اگر ذرا بھی آپ اپنی جگہ سے ہلے تو یاد رکھیے

آپ کے سینے کے آ رہا ہو گئی۔

غرض سلطانہ نے ڈرتے ڈرتے اپنا کام انجام دیا۔

اصغر در اچھا اب ایک کرسی اس کے پیچھے لیجا کر رکھ دیجئے۔ اور جب یوسف کے پیچھے کرسی رکھ دی گئی تو اصغر نے اُسے دیکھتے ہوئے ڈانٹ کر کہا۔ بیٹھ جاؤ اور مسٹر یوسف کو بیٹھنا پڑا۔

اصغر۔ بلیک صاحبہ، اب دوسرے مکتب کی رسی بھی کھول لائیے۔

سلطانہ دوڑ کر لئی اور رسی کھول کر بولی۔ یہ دو ٹکڑے نکلے۔

اصغر۔ کوئی حرج نہیں۔ اور اچھا ہے (مسکرا کر) ایک سے تو ان حضرت کے دونوں

پیر باندھ دیجئے اور دوسرے ٹکڑے سے انھیں کرسی کے ساتھ جکڑ دیجئے۔

یوسف کا اکر بس چلتا تو وہ اصغر کو کچا کھا جاتا مگر سپتوں کی مال اپنی طرف دیکھ کر اس کی روح فنا ہوئی جاتی تھی۔

القصد مسٹر یوسف کرسی سے باندھ دیئے گئے۔ اور اصغر سپتوں کو اپنی

جیب میں کھسک کر حسن آرا کی ماں کی چار بائی کے قریب پہنچا۔ جیسے ہی اصغر نے

رضائی اس کے منہ پر سے ہٹائی وہ ہو ہو کر کے اس زور سے چلائی کہ سلطانہ

اُچھل پڑی۔

اصغر۔ (بڑھیا سے) تم کو بھی پلنگ سے باندھ دیں۔ اگر اپنی خیریت چاہتی ہو

تو اٹھو ہمارے ساتھ چلو۔

بڑھیا (دڑک کر اٹھتے ہوئے) چلو چلو مگر یہ تو بتا دو۔ کہاں لیجا کر گئے۔

اصغر۔ (بڑھیا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے) چلو۔ بکو اس نہ کرو۔

الفرض یہ تینوں خیمے کے باہر آئے۔ صبح صادق تھی۔ نسیم سحری دریا پر سے
 ہوتی ہوئی جنگلی درختوں کے قریب جا کر اپنی زبان میں نہ معلوم ان سے کیا
 کہہ رہی کہ وہ جہ میں آکر جھوم جھوم جاتے اور ایک ایک کونے سے نکلتے گانے گاتے۔
 سلطانہ نے دریا کی طرف حسرت سے دیکھا۔ اصغر سمجھ گیا۔ اُس نے کہا۔
 مدہیم صاحبہ۔ آپ فکر نہ کریں۔ گاڑی بان نے اُن کو ہرگز پانی میں
 نہیں ڈالا۔ آپ ذرا غور تو فرمائیے۔ دریا یہ موجود ہے۔ اگر وہ ان کو پانی میں
 میں پھینکنا چاہتا تو دوسٹ میں اپنا کام کر کے واپس چلا آتا۔ مگر اس کا دیکھنے
 اب تک پتہ نہیں۔ اس سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے کہیں اور لے گیا ہے۔ میرے
 خیال میں اس نے مٹوڑی دور لے جا کر چھوڑ دیا ہوگا۔ میں جانتا ہوں یہ
 گاڑی بان آدمی رحمدل ہے۔
 سلطانہ کچھ لہنا ہی چاہتی تھی کہ سامنے سے گاڑی بان آتا ہوا دکھائی دیا۔

باب ۲

”آن پھنسے کی بات ہے۔“

”نرائن نرائن“ سلطانہ چلائی۔ ”اختر کو تو نے کہاں چھوڑا۔“

”جگو،“ گاڑی بان بولا۔ ”کاتبوں جہاں کا حکم تھا وہیں چھوڑا۔ مٹو۔“

صاب حکم کا تا بیدار ہوں۔“

سلطانہ اپنا سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔

اصغر دہشتورل نکالتے ہوئے، جھوٹ بولتا ہے۔۔۔ سچ پتہ بتا۔ ورنہ یاد رکھو،
میں ڈھیر ہو جائے گا۔

نرائن دہاندہ جوڑ کر کانپتے ہوئے (ارے نہیں، چور! گریب آدمی ہوں۔ بال بچے
بھوکوں مر جائیں گے سب۔)

اصغر دہشتورل بلاتے ہوئے (بول۔۔۔)

نرائن (ڈرتے ہوئے) ارے ارے۔ بتانا ہوں۔ بتانا ہوں۔

اصغر (ڈپٹ کر) جلدی بتا۔ آخر کہاں ہیں؟

نرائن (جھور سچی کہوں (آہستہ سے) پرنتو آپ سب سے مت کہنا۔ اُٹھو،
سن لیا تو تمھاری مٹی پلید ہو جائے گی۔ سب بات بول گئی کہ موکو۔ اس گریب
ترس اُگیو۔ موے سو چو کہ و سکو جنگل میں چھوڑ دوں۔ سو و سکو اُٹھا کے موڈرالے
بڑھ گیو۔ پر موکو پھر کھیاں آیا کہ پھر کہیں یہ وہیں سب کے پاس ہو چکے گیو تو
بڑی برسی ہو سکی۔ سو پنھنے لگو کہ کاکروں۔ اتفاق کی بات نہی میں موکو
ایک ڈونگا دکھو۔ بس جھور موے اس گریب کو ڈونگے میں ٹپک دیو اور ڈونگے
کو پانی میں چور سے دھکا دیو۔

اصغر (پھر گیا ہوا وہ ڈونگا کدھر گیا؟)

نرائن (سوئے پھر ڈونگے کو پلٹ کے بھی نہیں دیکھو۔ بس اوپر چلے آؤ۔)

اصغر (اچھا چل۔ ہم کو وہ جگہ بتا جہاں تو نے اس کو چھوڑا ہے۔)

نرائن (ہو سرکار پر جبراً سب سے تو کہدوں کہ مورا نپا کام کر آؤ۔)

اصغر نے نہیں صاحب سے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے چل کر وہ جگہ
بہیں دکھا۔ چل گاڑی جوت لے۔

الغرض نرائن نے گاڑی جوتی۔ پہلے سلطانہ پھر حسن آرا کی ماں اور
اسکے بعد اصغر گاڑی میں بیٹھے۔ چلتے وقت اصغر نے چلتا کر کہا۔
”خدا حافظ یوسف صاحب“

یوسف کی آواز ”احسان فراموش اصغر کے بچے۔ بھول گیا۔ میں نے تیری جان
بچائی تھی۔ اب تک تو تیری راکھ کا بھی پتہ نہ ملتا“
اصغر ”بھولا نہیں۔ یاد ہے میرے محسن۔ لیکن اپنے محسن کو بُرائی سے بچانا میرا
فرض ہے۔ گھبراہٹ نہیں۔ تھوڑی دیر میں یہ نرائن آکر کھول دیکھا“
نرائن دھبہ آکر ”یہ کا کیسہ ہے جیور“
اصغر ”کچھ نہیں۔ چپکا بیٹھ“

نرائن ”ہوسرکار۔ دول میں م آن پھٹے کی بات ہے“
اب گاڑی آہستہ آہستہ دریا کے کنارے چلی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر
بعد گاڑی بان نے دریا کی طرف اشارہ کر کے ہوئے کہا۔ بس جیور، یہی جگہ ہے
اصغر نے دریا پر دو تک نظر ڈالی۔ سلطانہ بھی آنکھیں پھاڑے
دیکھ رہی تھی لیکن کہیں بھی ڈنگے کا پتہ نہ تھا۔
سلطانہ ”داصغرے، بیاں تو کوئی ڈونگا نظر نہیں آتا“
نرائن ”موتے تو جیور ہیں چھوڑو تھوڑو سکھو۔ بہہ ہا گیو ہو گو“
اصغر ”تو جھوٹ بول رہا ہے۔ دیکھ سچ سچ بتا دے۔ ورنہ یاد رکھ“

نرائن :۔ جو دنیا کی سوں۔ سو سچی بولوں ہوں۔“

اصغر :۔ دنیا کون ہے؟

نرائن :۔ سونکی بڑی چھوکری۔“

اصغر :۔ اچھا گاڑی اس گڑ واٹ پر لگائے۔“

نرائن :۔ ہو سرکار۔ جو حکم۔“

باب ۲۸

”یہ میرا آپ کا وعدہ ہے۔“

شہر کے خوبصورت بازار سے نکلتے ٹیکسی تھنڈی الی ٹھنڈی شکر پر ہوئی۔
اصغر ڈرائیور کے پاس اگلی سیٹ پر تھا اور سلطانہ پچھلی سیٹ پر حسن آرا کی
ماں کو ابھی ابھی بازار میں انہوں نے اتار دیا تھا۔ تاکہ وہ ٹھوڑا گاڑی کر کے اپنے گھر کا
راستہ لے۔

سلطانہ گردن جھکائے کسی گہری سوچ میں پڑی ہوئی تھی۔ اور اصغر سوچ
رہا تھا کہ وہ کس طرح بیٹھ محمود بھائی سے سلطانہ کی ساری داستان بیان کر دیتا۔
یہ ایک اُس کو کچھ خیال آیا۔ ”سیکس صاحبہ“ یقین مانیے۔ یہ نرائن کا بچہ چھوٹوں کا پیر
ہے۔ اس نے اختر کو یقینی کہیں خشک میں چھوڑ دیا ہے اور ہم لوگوں کو اس ڈر سے
نہیں بتاتا کہ کہیں اس کے صاحب کو نہ معلوم ہو جائے۔ تو کا بچھا یہ نہیں سمجھتا کہ

یہ کوئی چھپتے والی بات تو ہے نہیں۔ سمجھ کا پھیر ہے۔ گنوار تو گنوار ہے۔ ہر حال کوئی
 فکر کی بات نہیں۔ میں انشا اللہ انھیں ضرور ڈھونڈ دے گا۔ آپ الطینان
 زکریا۔ یہ میرا آگے وعدہ ہے۔ خدا نے چاہا تو کل تک میں پتہ لگا لوں گا۔
 سلطانہ کی آنکھوں سے ہنسیاں لگی ہوئی تھیں اور نہ جانے کیا کیا کیا
 اس کے دماغ میں حکم لگا رہے تھے۔

باب ۲۹

”آخر ہوا کیا“

پانچ بد معاشوں میں سے چار تو دلاور کے حکم سے ایک طرف مل گئے
 تھے۔ جسوقت دلاور سلطانہ کی عصمت و رمی کرنا چاہتا تھا، لیکن پانچواں نظیر
 دوسری طرف سیٹھی بجا ہوا شکل لیا تھا۔ نہ جانے اندھیرے میں اپنے دوستوں
 سے الگ ہو کر وہ کدھر جا رہا تھا کہ آدم خوروں نے اس پر حملہ کیا۔ یہ وہی موٹا بازہ
 شخصیت جسکو عیشیوں کی ایک ٹولی گیند کی طرح اچھالتی ہوئی اپنی جھوٹریوں
 کے پاس اسوقت لائی تھی جب دلاور کو کڑھانوں میں ڈالنے کیلئے سر سے اڑھایا گیا تھا
 کیا تھا۔

اب یہ چار بد معاش سارے جنگل میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ان کو
 سخت تعجب تھا کہ دلاور سلطانہ کو لیکر آخر کہاں لوپ ہو گیا۔ اور یہ کیمت نظیر بھی

کہ صرغائب ہو گیا۔ تمام جنگل اُٹھوں نے چھان مارا لیکن بیسود۔ اب وہ بائیں
کرتے ہوئے دریا کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے۔

ایک بد معاش : (اُننگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) وہ سفید سفید کیا چیز ہے ؟

دوسرا : تو تو بس اسی فکر میں مرا جاتا ہے۔ یہ کیا ہے وہ کیا ہے ؟

پہلا : پگلے تجھ سے کون پوچھتا ہے ؟

دوسرا : اچھا اور تو بڑا سیانا بنا ہے ؟

تیسرا : اماں کیوں لڑنے ہو یا ؟

پہلا : یہ پاگل ہے بھتیہ ؟

چوتھا (دھسکر) آخر ہوا کیا ؟

دوسرا : کچھ بھی نہیں یا۔ اس کی تو عقل جاتی رہی ہے ؟

پہلا (دوسرے کو غور سے دیکھ کر) عقل جاتی رہی ہے۔ (چوتھے کو مخاطب کر کے)

رفیق بھائی، ذرا دیکھتا۔ میں نے اتنا ہی پوچھا تھا کہ وہ سفید سفید

چیز جو دکھائی دے رہی ہے کیا ہے۔؟ بس لگا اُلٹی سیل جی کہنے۔ عجیب قسم کا

آدمی ہے۔ دماغ لوٹا ہوا ہے اس شخص کا ؟

دوسرا : ابے دماغ تیرا لوٹا ہوا ہوگا۔ رفیق بھائی

رفیق بھائی : اماں ہوگا۔ اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ ذرا سی بات پر لڑنے مرنے

کو تیار۔ اُسے پوچھا بھی تو کیا۔ برا کیا۔ (پہلے کی طرف دیکھ کر) بھتیہ وہ تمھاری سفید

سفید چیز تو مجھے ڈیرہ معلوم ہوتی ہے۔

باب ۳

”تلی ٹوٹ گئی تھی“

دریا کے بہاؤ کے ساتھ باوا آدم کے وقت کا ایک ڈونگا کسی چلبلی رقاصہ کی طرح ہزاروں بل کھاتا۔ مچلتا۔ گٹکتا۔ چلا جا رہا تھا اور ایک خوشرو نوجوان اس میں بندھا بندھا پا پڑا کسی شدید تکلیف سے کرا رہا تھا۔ یہ کون تھا؟ یہ وہی گردش روزگار کا تارکاتایا ہوا اختر تھا جس نے آنکھ کھولتے ہی مصیبت کی دنیا کو دیکھا۔ اور دیکھ رہا تھا۔ جس نے راحت کا صرف نام ہی نام سنا تھا لیکن جو پریم کے سمندر کا سچا بھاری تھا۔

اب ڈونگا اُس جگہ پر تھا جہاں دریا کا بیٹھا پانی سمندر کے کھاری پانی سے ملتا تھا۔ اختر کی ران میں ٹیس پڑ رہی تھی۔ رکیونیکہ یوسف کے سپتول کی گولی آ رہی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہڈی کے قریب گوشت میں گھسی ہوئی تیر کی طرح بچھری ہوئی تھی۔ یکایک ڈونگا گول گول گھومنے لگا۔ اب وہ بھنور میں اس قدر تیز گھوم رہا تھا کہ اختر کو یقین ہو گیا کہ اس کا خاتمہ قریب ہی۔ وہ خدا سے دہیان لگائے آنکھیں بند کیے چپکا پڑا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب دماغ کا چکر کھبکم ہو ا تو اختر نے آنکھیں کھولیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ ڈونگا سمندر کی لہروں پر مثلنا ہوا سیدھا چلا جا رہا ہے۔ اختر کی پیچھے کوٹھنڈے پانی کا احساس ہوا۔ ڈونگے کی تلی ٹوٹ گئی تھی۔ اور پانی

آہستہ آہستہ دس رہا تھا۔

اب اُس نے سوچا ”مھوڑی دیر بعد سلطانہ کا سچا عاشق دریا کی تہ میں ہو گا۔“
کیا کشتی پانی میں غرق ہو جائے گی؟ کیا آخر کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔

باب ۳

”وہ غصے سے کانپ رہا تھا“

یوسف ڈیرے میں کرسی سے بندھا ہوا اصغر کی جان کو رو رہا تھا۔ غصے
سے اُسکا منہ سُرخ تھا۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا۔

”اچھا اصغر۔ وہ نرا چلھایا ہو کہ تو بھی یاد کرے عمر بھر۔ ٹھہر جا۔ ذرا نرائن کو
آجلنے دے۔۔۔ (زور سے) کون۔ نرائن؟ اُس نے پلٹ کر
دروازے کی طرف دیکھا۔

”اُہا، یوسف صاحب“ رفیق بھائی نے دروازے پر سے کہا۔ ”اے

یہ کیا قصہ ہے یہاں۔ یہ کس نے آپ کو بانڈھ دیا“

یوسف (جھینپ کر) پہلے کھو لو۔ پھر پوچھنا“

رفیق بھائی (پلٹ کر اپنے تینوں دوستوں سے) ”اؤ اندر چلے آؤ۔ اب سب

ڈیرے کے اندر تھے اور رفیق بھائی مسٹر یوسف کو کھولنے میں مشغول تھے۔

رفیق بھائی ”اُت فوہ۔ تمام برتیں پڑ گئیں۔ یہ کس نے آپ کو اس قدر

کس دیا بھٹا

یوسف (کھڑے ہو کر ڈیرے کی چھت کو غصے سے دیکھتے ہوئے) ایک منحوس ابرام
ایک احسان فراموش نے جس کو اگر میں نہ بچاتا تو کبھی کا جل جہنم کہ کسباب
ہو جاتا۔ آج کل کی دنیا میں نیکی کا بدلہ بدی ہے۔ (اصغر)
اصغر، آنکھیں نکال کر چھت کو نکاد کھاتے ہوئے، ایسا مزہ کھایا ہو کہ مرتے مرتے
بھی ذائقہ تیری زبان پر ہے۔

اصغر کا نام سن کر ان چاروں کے کان کھڑے ہوئے۔

رفیق بھائی: یہ کون بزرگ ہیں؟

یوسف (غصہ سے) میں نہیں جانتا اس کا شجرہ مگر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ بے ایمان
بے کسی کمین کی اولاد ہے کچھ سوچ کر شاید تمہاری ہی ٹولی کا تہہ وہ۔
رفیق بھائی کچھ کہنا چاہتے تھے نرائن ڈیرے میں داخل ہو۔

نرائن: چنیا کی سوں۔ چور مرگیا۔

یوسف (ذور سے) کیا کہتا ہے یون مرگیا؟

نرائن: چور بھلا مرنا کون۔ گریب بھارتے ہیں۔ مو مرگیا آج تو سباب

رفیق بھائی: (ہنستے ہوئے) اور امیر نہیں مرتے۔

نرائن: ارے چور مرتے تو امیر بھی ہیں۔ پر تو سباب ہم گریب بیچارے بہت مرتے ہیں۔

بھاکوں سے ہم مرتے ہیں۔ بھکروں سے ہم مرتے ہیں۔ اور سباب کالکوں۔ بڑے

آدمی کے چرنوں سے بچل کے ہم مرتے ہیں۔ گرج کے گھوب مرتے ہیں ہم مو تو

ساب سچی بات کسوں ہوں کسی کو بڑی ملے تو سو کا کدوں۔

۱۱۱

”جاؤ، منے اڑاؤ“ -

سیٹھ محمودؔ بھٹی میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تم نے ایسے وقت پر میری لڑکی کو بددوی ہے کہ " " " " " "

صغیر دستگیر (۱) یہ تو خاکسار کا فرض تھا کہ

سید محمد محمود :- تم کیا کام کرتے ہو ؟

اصغر: "حضور! فی الحال تو بیکار ہی ہوں۔"

سید محمد محمود۔ (ہاتھ بڑھاتے ہوئے) "لو یہ تو رکھ لو۔ مسٹھائی کھا لینا۔ اسکی۔"

اصغر، دھم دھم سے ہزار کا نوٹ لیتے ہوئے جھک کر، خدا حضور کی عمر میں برکت دے۔ زبان اس قابل نہیں کہ شکریہ ادا کر سکے۔“

سیٹھ محمود یو اسکے علاوہ ایک مکان تمھارے نام لکھ رہا ہوں تاکہ مستقل آمدنی ہو جائے تمھاری۔ کوئی بچپس ہزار کا ہے وہ۔ دو ڈھائی سو روپے ماہوار

کمرانیہ آتا ہے اس کا۔“

لہذا یہ انا ہے اس کا۔
 اصغر کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح
 سیٹھ محمود بھائی کا شکریہ ادا کرے۔ کھبراہٹ میں اُس نے سیٹھ صاحب کو
 دونوں ہاتھوں سے سلام پر سلام کرنا شروع کیا اور کچھ اس طرح سے کہ

محمود بھائی کو بھی ہنسی آگئی۔
 محمود بھائی۔ (ہنس کر) اچھا تو اب تم جاؤ۔ مرے اڑاؤ۔“

باب ۲۳

”قالت ٹھیک نہیں“

دھواں اڑاتا سمندر کی لہروں سے لڑتا لڑاتا ایک چھوٹا سا دُخانی جہاز
 تیز تیز تاسیدھا چلا جا رہا تھا۔

دُک پر دو شخص سوٹ پہنے کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔
 ایک۔ ”داس، اب تو افریقہ میں جی گھر الیا۔“
 داس۔ ”میرا بھی۔“

پہلا۔ ”بس تھوڑا سا کام اور رہ گیا ہے۔ پھر چلیں۔“
 داس۔ ”ہاں جیسی، اب تو دلی بُری طرح یاد آ رہی ہے۔“

پہلا۔ ”دو درہین آنکھوں پر رکھتے ہوئے، کئی دن سے خط بھی نہیں آیا۔ نہ جانے
 گھر کے کیا رنگ ہیں۔“

داس۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

پہلا۔ ”کچھ نہیں دیکھ رہی۔“

داس۔ ”ذرا مجھے دینا رشید۔“

رشید۔ دو درہن دیکر آنکھیں ملنے ہوئے، چائے پینا چاہیے۔

واس دو درہن سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے، منگاؤ۔

رشید۔ چلو اب پیچھے ہی چل کے پی لیں گے۔

واس۔ (سمندر کی سطح کو دو درہن میں سے گزرتے ہوئے) کشتی۔۔۔۔۔

ڈوب رہی ہے۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ اس میں

تو ایک آدمی بھی ہے۔

رشید (گھر آکر) کیا کہتے ہو؟

واس دو درہن رشید کو دیتے ہوئے، دیکھو،۔۔۔۔۔ وہ سامنے ہے

رشید۔ کہاں؟۔۔۔۔۔ ان کچھ ہے تو۔۔۔۔۔ ٹھیک کہتے ہو۔

نہ جانے یہ غریب زندہ ہے یا مردہ۔

واس۔ دیکھنا تو چاہیے۔۔۔۔۔ ان لوگوں سے کہو بچائیں اسے،

نہ جانے کون ہے غریب۔ چلو۔

قصہ مختصر نقوڑی دیر بعد جہاز کے ایک چکروٹے سے کمرے میں اختر

بیمبوشس پڑا تھا اور جہاز کا ڈاکٹر اسے ہوش میں لانے کی کوشش

کمرے رہا تھا۔ قریب ہی واس اور رشید بیٹھے ہوئے کبھی ڈاکٹر اور

کبھی اختر کو دیکھ رہے تھے۔ یکا یک ڈاکٹر نے رشید کی طرف دیکھ کر

منہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

”عالت ٹھیک نہیں ہے۔ سرسامی کیفیت ہے۔“

باب

”کب آؤ گے تم“

ماں باپ کی جس نے قدر نہیں کی۔ شاید وہ دنیا میں کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔

کس کو پڑی ہے جو مفت میں رو رو کر اپنی جان ہلکان کرے
کس کو پڑی ہے جو رات دن دھڑکے ہوئے دل کے ساتھ کسی کی
سلامتی کی دعائیں مانگیں۔ اس مادّی دنیا میں شاید کوئی کسی کا
نہیں۔ سب اپنے مطلب کے آشنا ہیں۔ لیکن ماں کی محبت دنیاوی
چیز نہیں معلوم ہوتی ہے۔ بھلا ایسی بے غرض محبت سوائے ماں کے
اور کون کر سکتا ہے۔

بیچارہ ماں بیچارہ ماں اب
آخر کی جدائی میں کھٹیا سے لگ چکی تھی۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا
جیسا آخر مہینوں برسوں سے غائب ہو۔ روتے روتے اس کی آنسو
بھی خشک ہو گئے تھے۔ دروازے پر اس کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔
”آخر بیٹے کب آؤ گے تم؟“ بوڑھی ماں کو مرنے وقت بھی صورت
نہیں دکھاؤ گے کیا؟
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس بٹہ چند دنوں کی مہمان ہے۔

”ہسپتال کے چلو ہسپتال“

رات کے دو بج رہے تھے۔ روتے روتے سلطانہ کی ابھی آنکھ لگی تھی کہ وہ چونک پڑی۔ کسی نے خواب میں اس سے کہا تھا۔ اختر مصیبت میں ہے دریا کے کنارے۔ " " " " " دریا کے کنارے والے گھاؤں میں۔ جا آئے بچا۔ اسی وقت جا۔ " " " " یوسف اس کے کپڑوں پر ٹیسل چھڑک کر آگ لگانا چاہتا ہے۔ جلدی کرو۔ " " " " سلطانہ گہرا کے اٹھ بیٹھی۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

”میں جاؤں گی، کچھ بھی ہو، میں جاؤں گی۔ ورنہ یوسف“
 مسہری پر سے کود کر اُس نے الماری کھولی۔ مارچ کو روشن کیا۔
 خاکی برصییس نکال کر ہینی۔ پھر بند گھمکے گا خاکی کوٹ پہنا۔ سر پر ایک خاکی
 رومال باندھا۔ جیب میں بھرا ہوا پستول رکھا اور اللہ کا نام لے کر اپنے
 کمرے سے نکلی۔ برآمدے میں ایک سرخ بتی جل رہی تھی جس کی دھیمی دھیمی
 روشنی اپنے کے قریب واسے سفید گلاب کے پھولوں کو خون میں رنگے دے
 رہی تھی۔ دبے پاؤں یہاں سے نکل کر وہ باغ میں آئی۔ چند سکند گیلے
 گھڑی۔ ادھر ادھر دیکھا اور اب تیز تیز قدم رکھتی ہوئی نازنگی کے درختوں سے

سے ہوتی کنوئیں کے قریب سے گزرتی باغ کی منڈیر کی طرف گردن جھکائے وہ کچھ
 سوچتی رہتی جلی جا رہی تھی۔ مٹھوڑی دیر بعد باغ سے نکل کر حور اسے پرکھڑی
 شاید وہ یہ سوچ رہی تھی کہ دریا کے کنارے والے گاؤں کا آدھس کے شعلت
 اُسے خواب میں بتایا گیا تھا۔ کون سا راستہ ہے۔ الغرض وہ دریا والی
 سڑک پر بھولی۔ دریا یہاں سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ
 دریا کے کنارے سڑک پر دوڑی جا رہی تھی۔ دفعتاً وہ ٹھہر گئی اور گھور گھور
 کے دریا میں نہ جانے کیا دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن اندھیرے میں
 اُسے کیا خاک نظر آتا۔ اُس نے ایک لمبی سی مٹھنڈی سانس لی۔ اور دونوں
 ہاتھوں سے اپنا سر کپڑے کے ڈھکی۔ ایک پل آیا۔ چند منٹ بعد وہ اُس
 پل کو پار کر کے سامنے والی جھوپڑیوں کی طرف بھولی۔

یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ کتوں نے زور زور سے بھونکنا شروع
 کیا۔ اسلئے وہیں اہلی کے درخت کے نیچے وہ چھوترے پر بیٹھ گئی اور سوچنے
 لگی۔ کیا یہی گاؤں ہے جہاں
 دور سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔

”ارے کون ہے رے،“ کسی نے زور سے چلا کر کہا۔
 ”کوئی نہیں بھتیہ۔ رستہ گیر ہے، ذرا یہاں تو آؤ۔“ سلطانہ بھاری
 آواز سے بولی۔

یکایک ایک رستی اُس کے پاؤں سے پیٹ گئی۔
 ”ہائے کاٹ لیا،“ وہ زور سے چلا پڑی۔

”کسی کو املی والے ناگ نے کاٹ لیا۔ کوئی چلا کر بولا۔
”دوڑے رے دوڑو“

دوسری آواز، ”کدھر ہے وہ؟“
پہلی آواز، ”املی کے نیچے“
تیسری آواز، ”ارے اب وہ کیا بچے گا۔ بڑا زہر بلا ناگ ہے وہاں۔
چوتھی آواز، ”اسپتال لے چلو اسپتال“

باب ۳۶

”موٹر فوراً رگ گئی“

آج احمد کے پاس ایک ہزار روپیہ تھا اور کل ایک مکان
اُس کے نام لکھا جانیوالا تھا۔ وہ بے انتہا خوش تھا۔ بے انتہا۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ خوشی سے اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ سیٹھ محمود کی کوٹھی
سے وہ سیٹھ صاحب کو دل ہی دل میں لاکھوں دعائیں دیتا ہوا نکلا۔
وہ سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ دیکھو نیکی کا بدلہ خدا نے مجھے کیا اچھا دیا۔
دلاور بیہ قوت، دیکھ تیری نیت خراب تھی تو تو آدم غوروں کے کوڑھاد میں

سلطانہ کی زبانی احمد دلاور کا انجام سن چکا تھا۔

کیسا چڑمڑ ہو کے رہ گیا۔ اب میں ان کی بخت چوروں کا ساتھ چھوڑ دوں گا۔ اور
 بدی سے جہاں تک ہو سکے گا بچوں کا۔ اگر انسان کو پیٹ بھر کھانے کو ملے تو وہ
 چوری کیوں کرے۔ اگر دنیا میں روپے کی تقسیم انصاف سے کی جائے تو ایک
 چوری کیا۔ بہت سی بری باتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ لیکن دنیا کی آنکھیں
 کب کھلیں گی خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

یہی سب وہ سوچ رہا تھا۔ دوسرے اسے سیدھے محمود والے ہزار کے
 نوٹ کو بھی نکال کر دیکھا اور پھر جلدی۔ جیب میں رکھ لیا۔ آج میری بیوی
 بچے کتنے خوش ہوں گے جب اُن کو یہ معلوم ہو گا کہ اب دونوں وقت انھیں
 پیٹ بھر کر روٹی ملا کرے گی۔ بیوی چیتھڑے لگائے نہیں پھرے گی۔ بچے سردی
 میں کا پتے ہوئے ننگے نہیں پھریں گے۔ اب وہ ہرگز رو کر یہ نہیں کہیں گے۔
 کہ "ابا ہمتو پھیل دی لڑتی ہے" جس کو شکر میرا کلیجہ کا بنے لگتا ہے اور میں
 چوری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ اب میں اُن کو اچھے سے اچھے کپڑے پہناؤنگا
 امیروں کے بچے جب نئے نئے کھلونوں سے کھیلتے ہیں تو میرے بچے کیسے تنگ
 میرے پاس آتے ہیں۔ "ابا ہم بھی ایت مو تن لیندے"۔

اب میں بھی بہت سے کھلونے دلاؤنگا۔ وہ کتنے خوش ہوں گے۔ میری
 گود میں آکر بیٹھ جائیں گے۔ مجھے پیار پر پیار کرنے لگیں گے۔ اس وقت خوشی سے میرے
 آنسو نکل پڑیں گے۔ میں اُن کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہوں گا۔ کھیلو میرے بچو کھیلو۔
 اللہ نے ہم پر فضل کیا۔ شکر ہے اس کا۔ قصہ ان ہی خیالات میں گم چلا جا رہا
 تھا۔ وہ مسجد کی طرف سے گزرا۔ "بہت دنوں سے میں نے نماز نہیں پڑھی۔"

دو رکعت نماز شکرانے کی تو پڑھ لوں۔ آج سے میں ضرور نماز شروع کر دوں گا۔
 وہ دیکر اس معبود سے اپنے پچھلے گناہ بخشواؤں گا۔ مسجد کے کمرے کے اُسے
 سنا ہی ہوں گا۔ لیکن نہیں خالی مسجدوں ہی سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے اس کی
 خدمت کرنا چاہیے۔ مگر اس کی خدمت کس طرح کروں؟ میرے خیال میں تو اس کی
 سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اُن غریبوں کی مدد کروں جن کے بچے میرے بچوں
 کی طرح بھوکے رہ رہے ہیں جن کے لخت جگر ان کی آنکھوں کے سامنے سر دیوں
 میں ٹھہر کر رہ جاتے ہیں۔ جن کو سماج جو رہنا کر ڈاکو اور قاتل بنا دیتا ہے
 اور پھر ایک دن اُن کو سزائے موت کا حکم سن کر پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیتا
 ہے۔ جب سماج بھوک کو رفع نہیں کر سکتا۔ تو اسے سزا دینے کا کیا اختیار ہے؟
 اعتدال کا منہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ جوتا اُتار کر مسجد میں داخل ہوا۔
 وہ جوش میں بھرا ہوا تھا۔ خدا کے سامنے خوب رویا۔ اور غریبوں کیلئے گڑ گڑا کر
 دعائیں مانگیں۔ جب وہ مسجد سے نکلا تو اُسے اپنی طبیعت میں کچھ ہلکان سا
 محسوس کیا۔ پھر اُسے کچھ خیال سا آیا۔ اُس نے سلطانہ سے کوئی وعدہ کیا تھا
 ہاں ہاں وہ اختر کو ڈھونڈھ کے رہیگا۔ کیا وہ پولیس میں یوسف کی رپورٹ
 کر دے؟ نہیں یوسف نے اس کی جان بچائی تھی۔ سید محمد محمود خود یوسف
 کو سمجھ لیں گے۔

جیسے ہی وہ سڑک کو پار کر کے دوسری طرف جانا چاہتا تھا کہ ایک تیز رفتار
 موٹر نے اُسے روند ڈالا۔ موٹر فوراً رُک گئی۔ دُرا یوسف نے کانپتے ہوئے ہاتھوں
 سے اصرار کو موٹر کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ پھر منہ لٹکائے ہوئے موٹر اسٹارٹ

کی۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

باب ۳

”کچھ نہیں“

اختر اب تک بیوش تھا۔ جہاز والوں نے اسے شہر کے اسپتال میں داخل کر دیا تھا۔ جہاں اُسے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں ذرا بھی آنکھ نہیں کھولی تھی۔ اس کی رات پریشی بندھی ہوئی تھی دگولی اُس کی ران سے نکال لی گئی تھی (ڈاکٹر اُسے بیوش میں لانے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ اسکا بدن بالکل دھوپا کھرا ہو رہا تھا۔ جیسے اس میں ایک قطرہ خون بھی نہ ہو۔
دفعۃً اختر نے آنکھیں کھولیں۔ آنکھیں کھپا کر آئیں۔ میں کہاں ہوں؟“

”اسپتال میں۔“ نرس نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ اُس نے پھر آنکھیں کھلا دیں۔

”طہر ایسے نہیں۔ اب آپ بالکل اچھے ہیں۔“ نرس آنکھیں شکا کر بولی۔

”اچھا ہوں؟“ اختر نے چاروں طرف دیکھا۔

”ہاں بالکل اچھے ہیں آپ۔“ نرس مسکرائی۔

”کیا ہو لیا تھا مجھے؟“

”ہیں۔۔۔ پاؤں میں درد کیوں ہوتا ہے؟“
 ”کچھ نہیں۔ آپ بالکل اچھے ہیں۔ لیجئے۔ یہ دوا پی لیجئے۔“
 نرس نے دوا کا گلاس اختر کے منہ سے لگا دیا۔ گلاس ہٹاتے ہوئے
 وہ بولی: ”آپ بالکل اچھے ہیں اب۔“
 اختر اپنے ہونٹوں میں کچھ بدبویا اور ایک دفعہ بھر سہوش ہو گیا۔

باب ۳۸

”کہیں پولیس“

یوسف حسن آرا طوائف کے یہاں گھاؤ تیکے سے لگا بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔
 اور حسن آرا کی ماں رورو کر سفید جھوٹ بول رہی تھی کہ کس طرح راستہ میں صخر
 اور سلطانہ نے اس کی گٹ بنائی تھی اور یوسف کو کیسی سیدھی سیدھی گالیاں
 وہ لوگ دے رہے تھے۔ بڑھیا کچھ اس طرح نک مرچ لگا کر کہہ رہی تھی کہ یوسف
 غصے سے بالکل حینہ ہو گیا۔ جتنا جتنا اسکے غصے میں اضافہ ہوتا اتنے ہی وہ
 سے وہ حقہ کاشکھنے لگتا۔ اور بھاری آواز سے ”ہوں“ کہہ کر
 چپ ہو جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکی آنکھوں میں انکار بھرے
 ہوئے ہیں۔ انتقام کی آگ اس کے سینے میں جلی رہی تھی۔ عین مزے
 کے وقت اس کمبخت اصغر نے سلطانہ کو اس کے بچے سے چھڑا لیا تھا۔

وہ اصغر جس کی جان اُس نے بچائی تھی۔ وہ اصغر جو آگ کے شعلوں میں جل ٹھہن کر
راکھ ہو جاتا۔ پھر اس منحوس احسان فراموش اصغر نے اسکو کرسی کیساتھ بندھوا دیا
تھا۔ نیلی کا بدلہ بدی وہ اس سے ضرور انتقام لے گا۔

ضرور لے گا۔ اس نابکار اصغر کے بچے سے
اور وہ اور وہ بلی جیسی آنکھوں والی نوڈیا وہی کمبخت
جو اس بد معاش اختر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ وہی کمبخت جو میری طرف دیکھنا
بھی پسند نہیں کرتی۔ حرافہ کہیں کی وہ کہاں
جائنگی بچ کر۔

”میں ان دونوں سے بدلہ لے کے رہوں گا۔ جب تک بدلہ نہ لے لوں
چین مجھے تھیب نہیں ہو سکتا۔“

اُس نے حقہ کی نئے سے منہ لگا کر زور سے کھینچا۔ مگر میں نے بھی اُس کے
یار کو کیسی سزا دی ہے۔ اب تک تو بیٹا اختر کو بقول زائن کے مچھلیوں نے کھاپی کر
برابر بھی کر دیا ہوگا۔ لیکن کہیں ان کمبختوں نے
میری رپورٹ نہ کر دی ہو۔ ضرور کی ہوگی۔ کہیں
پولیس وہ سوچنے لگا۔

جیسے ہی حسن آرا ہاتھ میں شربت کا گلاس لئے ہوئے کمرے میں داخل
ہوئی اس کی ماں اٹھکر چلی گئی۔

یوسف نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ سے شربت کا
گلاس لے کر اس کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔

باب ۲۹

اب اس کو چکر آنا شروع ہو گئے تھے۔

ہسپتال کے ایک چھوٹے سے کمرے میں لوہے کے پلنگ پر پڑی ہوئی ایک حسین لڑکی اونگ اونگ کر بار بار سونے کی فصول کو شش کو رہی تھی۔ کیونکہ جب یہ ذرا بھی اونگتی تو ایک موٹی سی نرس اس کا کندھا پکڑ کر زور سے ہلا دیتی اور کسی طرح بھی اسے سونے نہ دیتی۔ شاید یہ اسلئے تھا کہ سانپ کے کانٹے ہوئے کو پیند بہت آتی ہے اور اگر وہ سو جائے تو پھر اس کا جاننا ذرا مشکل ہی ہے۔ یوں تو اس گاؤں کے ایک گنوار نے (جہاں سلطانہ کو سانپ کے کاٹا تھا) مور کے پر کے تاج کا ایک چھوٹا سا نیلا ریشہ نکال کر گڑ کی ٹولی میں اسے کھل دیا تھا اس گنوار کا دعویٰ تھا کہ اس دو اکو اگر سانپ کے کانٹے کے فوراً بعد ہی کھل دیا جائے تو پھر وہ شخص مر نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ گاؤں کے پٹواری نے بھی جو اسوقت وہاں موجود تھا۔ سلطانہ کے زخم میں پوٹاشیم پرمینگنیٹ (جسکو یہ ہمیشہ ایسے موقعوں کیلئے ساتھ رکھتا تھا) بھر دیا تھا۔ تب بھی پٹواری کی رائے سے گاؤں والے سلطانہ کو گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے آئے تھے۔ جہاں اب یہ لٹی ہوئی اونگ رہی تھی۔ اسے اسوقت بیدار نہیں آ رہا تھا۔ اور یہ بار بار پسینے کو اپنی آستین سے پوچھ رہی تھی۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد نرس اس کے منہ میں دو دو تھپے دوڑا دیتی

تھی۔ اور گھنٹہ گھنٹہ بھر کے بعد ڈاکٹر بھی اسکو آ کے دیکھ لیتا تھا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اگر جگر نہیں آئے تو وہ پتہ نہ چکے جائے گی۔ لیکن اب اس کو چکرا تا شروع ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر نے ابھی ابھی اس کے والد سپٹھ محمود کو بھی ٹیلیفون کر دیا تھا اور وہ دونوں بیاں ہوی موٹر میں روتے پیتے چلے آ رہے تھے۔ سلطانہ مرنے سے پہلے آخر کو ایک نظر دیکھ لینا چاہتی تھی لیکن اس غریب کو کیا پتہ کہ اس کا آخر بھی اسی ہسپتال کے ایک کمرے میں پڑا موت کے خواب بکھ رہا ہے۔

باب

”مصیبت آئے تو سکر او“

اسی ہسپتال میں جہاں سلطانہ اور آخر الگ الگ کمروں میں پڑے ملک الموت کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر بھی ایک کمرے میں پڑا تھا۔ موٹر سے نکل کر وہیں اسکا سر کپڑی کے پاس سے پھٹ لیا تھا۔ جسمیں سے خون جاری تھا۔ چار ٹانگے آئے جب کہیں جا کے خون بند ہوا غریب کوئی بارہ گھنٹے بیہوش رہا۔ لیکن اب تو یہ ہوش میں آچکا تھا۔ اور اس آفت ناکہانی پر پڑا ہنس رہا تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ جب مصیبت آئے تو سکر او۔

”یہ سب کچھ مرے گناہوں کا کفارہ ہے۔“

لیٹا لیٹا وہ سو سوچا کیا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا کہیں کسی نے وہ ہزار کا نوٹ تو نہیں اڑا دیا۔ نوٹ اس کی جیب میں موجود تھا۔ اُس نے اطمینان کی سانس لی۔ پھر نرس کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ قریب آگئی تو آہستہ سے اُس نے کہا: ”بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔“

”کیا کھاؤ گے؟“ نرس نے مسکرا کر کہا۔

”جو کھلاؤ؟“ اصغر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”زیادہ ہنسومت۔ ٹانگوں پر زور پڑے گا۔“ یہ کہہ نرس چلی گئی اور بھوڑی دیر بعد ایک کٹورا لیے ہوئے واپس آئی۔

”لو ابھی تو تم کو یہی ملیگا۔“

”کیا ہے؟“

”دودھ۔“

نرس نے دودھ کا کٹورا اصغر کے منہ سے لگا دیا۔ اور غٹ غٹ غٹ غٹ وہ سب پی گیا۔

”اتنے سے کیا ہوتا ہے؟“ وہ مسکرا کر بولا۔ میری دائرہ بھی گرم نہیں ہوئی۔“

”برائے اب سو جاؤ۔“ نرس بولی۔ زیادہ باتیں نہ کرو۔ نہیں تو تمہارا سر میں درد ہونے لگے گا۔“

اصغر نے مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

”بس دو تین دن میں یہاں سے چلا جاؤں گا“ اُس نے سوچا۔ ”ہاں بچے
 یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ میں مر گیا۔۔۔۔۔ او ڈو مجھے اپنا وعدہ بھی تو پورا
 کرنا ہے۔ جو سلطانہ سے کیا تھا میں نے۔ وہی اختر کے ڈھونڈنے کا۔“
 اس غریب کو کیا پتہ کہ اختر بھی اسی اسپتال میں موجود ہے۔ اور
 سلطانہ بھی یہیں آگئی ہے۔

باب

”کیا تم کو سکو گئی۔“

اب اختر کو پھر ہوش آچکا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے دونوں ہاتھ انجکشنوں
 سے گود ڈالے۔ ابھی ابھی اس دوا پہلے کے لٹی تھی۔

وہ خاموش ٹنگی باندھے چھت کو دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے سلطانہ کہاں ہوگی
 وہ غریب نے ہی سمجھ رہی ہوگی کہ اختر مر گیا۔ کیسی ٹرپ رہی تھی اُس دن۔۔۔
 جب اُس ظالم بھائی نے۔۔۔ کیا نام تھا اس کا۔۔۔ ہاں یوسف
 جب یوسف نے مجھ پر فائر کیا تھا۔ نہ جانے پھر اس بچا رہی پر کیا گزری۔
 وہ بد معاش شراب میں دھت ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ خدا کرے میری
 سلطانہ ابھی ہو۔ کتنی اچھی ہے وہ۔ ”اختر سوچے جا رہا تھا۔“ میرا دنیا میں۔
 بیٹھا ہی کون ہے ایک وہ۔۔۔۔۔ اور ایک میری بوڑھی ماں۔۔۔

کہ۔۔۔ میں اپنی بوڑھی مصیبت زدہ ماں کو تو بھول ہی گیا۔ کتنا برا ہوں
میں۔ وہ تو یقیناً رنج سے پاگل ہو گئی ہوگی۔ اُس غریب کو کچھ خبر نہیں کہ میں
کہاں ہوں۔ نہ جانے کیا کیا خیال اس کے دل میں اُڑ رہے ہوں۔ میں
اُسے کیسے خبر دوں کہ میں یہاں ہوں۔ اس نرس کو بلاؤں۔ اس سے
کہوں۔ شاید یہ میری کچھ مدد کر سکے۔“

اختر نے نرس کی طرف رجوع را دوں کھڑی تھی، دیکھا۔ وہ فوراً
ہی آگئی اور بولی۔ کیا بات ہو؟
”کچھ نہیں۔ ایک کام ہے۔ کیا تم کر سکو گی۔ اختر نے آہستہ سے کہا۔
”کیا کام ہے۔ میں ضرور کروں گی۔“
”میری ماں کو بلا دو۔“

جب اختر نے نرس کو اپنی ماں کا پتہ بتایا تو اس نے سکر لاکر کہا۔
”آج نہیں۔ میں کل ضرور بلا دوں گی اُن کو۔“
”شکریہ،“ اختر کے منہ سے نکلا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کیا سلطانہ سے
بھی کہلا بھیجے کہ وہ ہسپتال میں پڑا ہے۔ ذرا اپنی صورت دکھا جاو اس بے نصیب کو۔
مگر نہیں۔ خدا جانے اس کے والدین کیا سمجھیں۔ لیکن اگر چپ کے سے
اُس کو خبر بھیجوں تو؟
ہی ادھیڑ بن میں اختر کی آنکھ لگ گئی۔

کل صبح کو تھیں اسپتال لے آئے۔
 الغرض ڈاکٹر صاحب نے حسن آری کے بازو میں ایک انجکشن لگا دیا اور میں
 لیکر آداب عرض کرتے ہوئے چھپت ہو گئے۔

باب

”اُس نے سب کو دیکھ لیا۔“

سیٹھ محمود بھائی دونوں ہاتھ پیچھے باندھے ہوئے اسپتال کے برآمدے میں
 بیٹھ بیٹھ رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی سخت پریشانی میں مبتلا ہیں کبھی سر
 پکڑ لیتے۔ کبھی رومال نکال کر سینہ پوچھنے لگتے۔ لمبی لمبی سانسیں لیکر کبھی انگلی دانتوں
 کے نیچے دبالتے۔ برآمدے کی چھت کو دیکھنے لگتے۔ پھر زپیں کو کھورنے لگتے۔ سٹریٹ
 کے بجائے دیاسلانی کی تیلی منہ میں لیکر جلانے کی کوشش کرتے۔ پھر اپنے آپ چونک
 پڑتے اور۔۔۔ ہر ادھر دیکھنے لگتے۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگتے۔ منتیں مانگتے غرض
 سیٹھ محمود ایک عجیب پریشانی کے عالم میں تھے۔ دفعتاً سلطانہ کے کمرے سے ڈاکٹر
 مسکراتا ہوا نکلا۔

”کوئی گھبرانے کی بات نہیں سیٹھ صاحب۔ اللہ نے اپنا فضل کیا۔ وہ چکر
 جاتے رہے۔ اب کوئی ڈر نہیں۔ اندر تشریف لیجئے۔“
 سیٹھ محمود بھائی خوشی سے رو پیے۔ برآمدے کی چھت کو دیکھا اور۔

سلطانہ کے کمرے میں داخل ہو گئے۔
 یکایک ہسپتال کی نشیت والی کھڑکی سے ایک سر نکلا۔ اور آہٹ پاتے ہی نچا
 ہو کر فوراً غائب ہو گیا کسی نے اسکو نہیں دیکھا لیکن اس نے سب کو دیکھ لیا۔

باب

”کہیں نرس تو نہیں آ رہی“
 اصغر ہسپتال میں پڑے پڑے گھبرا لیا۔ اس نے کئی بار کہا بھی کہ ابتداء
 اچھا ہو گیا ہے اب اسے گھر جانے دیا جائے۔ لیکن ڈاکٹروں کا حکم تھا کہ ابھی
 اسے دو تین دن اور مٹھنا پڑے گا۔

اصغر نرس سے، لیکن ابتداء میں بالکل اچھا ہوں۔ پھر مجھے کیوں روک
 رہے ہو تم لوگ؟
 نرس۔ ”ایک دو روز مٹھنے میں تمہارا سوج ہی کیا ہے؟“
 اصغر۔ ”سوج یہ ہے کہ میرے بچے بھوکوں مر رہے ہیں۔ ان کو یہ تک پتہ نہیں کہ
 ان کا باپ کیا کہاں؟“

نرس۔ ”آنکھیں چلا کر، تو بلوا لو ان کو یہاں۔“
 اصغر۔ ”کس بلوالوں؟“۔ ”میں خود جاؤں گا۔“
 نرس۔ ”دیسنا ابھار کر، لیکن ابھی تو تم کو جانا نہیں ملیگا۔“

یہ کہہ کر نرس شگفتہ ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی اور اصغر دانت پیکر رہ گیا۔
 مگر اس وقت اس کھڑکی سے کوئی نہیں یہاں سے بھاگ جاؤں تو یہ سب
 کیا کریں گے میرا۔ اندھیرا تو ہو ہی گیا ہے اور اس وقت اسپتال کے پیچھے بھی کون
 ہوگا۔ مگر احتیاطاً ذرا جھانک کر دیکھ لوں۔
 اُس نے کھڑکی سے گردن نکال کر دیکھا۔ اندھیرا کھپ۔ مسکراہٹ اس کے
 لبوں پر دوڑ گئی۔ پلٹ کر اُس نے کمرے میں دیکھا۔ کہیں نرس تو نہیں آ رہی سو
 اللہ کا نام لیا۔ ہر باندھ کر دھڑ سے کھڑکی کے پیچھے کودا۔ اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔
 اصغر تو یہی سمجھا کہ کسی نے اس کو دیکھا نہیں لیکن ایک نقاب پوش درج
 اعلیٰ کے درخت کے قریب تھا۔ اس کو جلتے ہوئے چھپا دیکھ رہا تھا اور اب تو سڑک
 کی روشنی میں اُس نے اصغر کو اچھی طرح پہچان بھی لیا تھا۔

باب ۲۵

”بھار کافی تیز ہے“

اختر آج بچپنی سے اپنی ماں کا انتظار کر رہا تھا۔ نرس نے اُس سے
 وعدہ کیا تھا کہ وہ آج اس کی ماں کو ضرور ملوادیگی۔
 اختر نرس سے جوا بھی (بھی کمرے میں آئی تھی) ابھی تک تو آپس نہیں
 نرس (بھلا کر) ادنیٰ تو میں نے صبح ہی بیدیا ہے۔

اختر نہ جانے کیسی طبیعت ہوگی اُن کی۔
 نرس : آپ فکر نہ کیجئے ابھی معلوم ہو جائے گا۔ دیکھئے آپ کے گالوں پر ہلکی ہلکی سُرخی
 بچلی ہے۔ بس ایک ہفتہ بعد آپ بالکل خُٹ ہو جائے گا۔
 اختر (جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہ ہوا) یہ آدمی نہ جانے کب تک آئے گا۔ اتنا وہ
 کہنے پایا تھا کہ خادم نے کمرے میں داخل ہو کر نرس سے کہا۔
 ”وہ تو بیوش پڑی ہوئی ہیں۔ بخار کافی تیز ہے۔ مکان بڑی مشکل سے ملا
 اسی لئے دیر ہو گئی۔“

اختر (گھبرا کر) کون بیوش پڑی ہوئی ہیں؟ اماں؟
 نرس نے خادم کو آنکھ کا اشارہ بھی دیا لیکن اس کے منہ سے نکل ہی گیا۔
 ”جی ہاں۔“

اختر (اپنا سر دونوں ہاتھوں پر پکڑ کر) تم نے میرے متعلق کچھ نہیں کہا اُن سے۔
 خادم : کتنا کیا؟ بیوش میں ہوتیں تو کچھ بات بھی کرتا۔
 نرس : ”آپ فکر نہ کریں۔ میں بھی بند گاڑی بھیج کر ان کو یہیں اسپتال میں داخل کئے
 لیتی ہوں۔“
 اختر : ”شکریہ آپ کا۔“

نرس (جاتے ہوئے) میں ابھی ڈاکٹر صاحب سے کہہ کر گاڑی کا انتظام کرا رہی ہوں
 (خادم سے) لٹو دیکھو تم کہیں جانا نہیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔ گاڑی کے ساتھ
 تم کو جانے۔

باب ۴۶

”چپ کے سے سلو پائرن“

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ یوسف حسن اراطوالف کے کوٹھے سے اتر کر اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں اس وقت عجیب خیالات چکر لگا رہے تھے۔ آج اس کو حسن اراکی ایکس سے کی رپورٹ مل گئی تھی۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ شاید پیٹ میں بھوڑا ہو۔ اسی وجہ سے اس نے ایکس سے کرایا تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ بھوڑا اور خطرناک نہیں تھا۔ اور اگر کہیں یہ بھت بھوڑا ہوتا تو پھر تو آپریشن کرانا ہی پڑتا۔ یہ آپریشن بھی کتنی خطرناک چیز ہے خصوصاً پیٹ کا۔ کیا پتہ وہ بھتی یا نہیں۔ طوائف ہو کر کتنی باؤنا تھی وہ۔ یوسف سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ آج وہ سید خوش تھا۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ حسن ارا کے پیٹ میں بھوڑا نہیں تھا بلکہ اس لیے اور کہ آج اس نے اختر کو ہسپتال میں بکھ لیا تھا۔ اسے زندہ دیکھ کر یوسف کو خوشی تو نہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ صرف اس لیے خوش تھا کہ اب کوئی اسے اختر کا قاتل نہیں کہہ سکتا تھا۔ اگرچہ قاعدے سے تو مقدمہ اس پر اب بھی چل سکتا ہے۔ لیکن اوتھ ... وہ پرواہ نہیں کرتا۔ اس نے ایسے مقدمے بہت لڑے ہیں۔ وہ سب کچھ سوچ چکا ہے۔ اب تو کسی صورت سے اختر کو گمانٹھنا چاہیے۔ معافی مانگ کر کسی طرح اس سے دوستی پیدا کرنا چاہیے اور ایک ن دعوت میں چپ کے سے سلو پائرن ... پس ...

جس دن سے آدمی بچھ مہینے میں جھپک جھپک کے مڑتا ہے۔ یوسف مسکرا دیا۔ یہ آخر مجھ سے
 بچ کر جائے گا کہاں۔؟ لیکن اگر کہیں اس کمبخت نے مجھے معاف نہیں کیا اور میری
 دوستی کو ٹھکرا دیا تو۔۔۔؟ اوھ۔۔۔ دیکھا جائے گا۔ پہلے
 کر لوں۔۔۔ اپنی سی۔۔۔“
 یہی سوچتا ہوا وہ ایک گلی میں مڑ گیا۔

باب

”ہوشیار رہو“

اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھی ہوئی سلطانہ ایک کتاب پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی
 آج صبح وہ اپنے والدین کے ساتھ گھر آ گئی تھی۔ اُسے اپنی والدہ سے صاف صاف
 کہہ دیا تھا کہ وہ آخر سے محبت کرتی ہے۔ آخر نے اپنی جان کی بازی لگا کر اُسے بچایا
 تھا۔ ورنہ اب تک وہ جشیوں کے پیٹ میں ہونچ کر ہضم ہونے کے بعد خون میں
 تبدیل ہو کر ان کی رگوں کے جال میں الجھ کر رہ جاتی۔۔۔۔۔ اسی لئے اپنے محسن
 کی تلاش میں وہ گھر سے نکلی تھی لیکن بدقسمتی سے سانپ نے کاٹ لیا۔
 سلطانہ نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ کیوں چھپائے وہ؟ کیا وہ کسی کی چوری
 کر رہی تھی؟ کیا محبت کرنا جرم ہے۔؟

کتاب کو اس نے بند کر دیا۔ ایک نظر چھت کو دیکھا اور اب زمین کو

اس طرح گھوم رہی تھی جیسے سمیرنیم کا عمل کر رہی ہو۔

وہ اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو ملنا شروع کر دیا۔ اب وہ کچھ سوچتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس کے دماغ میں ایک ایسی آنکھیں تھیں جس کو اختر کے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں سمجھا سکتا۔

وہ صوفے پر دھڑ سے کود پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے اُس نے اپنا چہرہ ڈھانک لیا۔ ٹھیک اُس وقت صوفے کے پیچھے والی کھڑکی سے ایک سفید لفافہ آکر اس کی گود میں گرا۔ وہ چونک پڑی۔ لفافہ کو اٹھا کر اُس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔

لفافہ چاک کرتے وقت اس نے کھڑکی کے قریب جا کر باہر دیکھا۔ اب بھی کوئی نظر نہ آیا۔

لفافہ کے اندر سے ایک سرخ رنگ کا کاغذ نکلا جس پر لکھا تھا۔
”سلطانہ تمھاری عزت اور جان خطرے میں ہے۔ ہوشیار رہو۔“
”ایک گنہگار“

سلطانہ کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ گنہگار کون ہے۔ اور اس کا مطلب

کیا ہے۔؟

پاٹ

”غریبوں کا خون“

آج اصغر کے بال بچوں کا پیٹ پسلیوں سے دو دو انگل باہر تھا۔

وہ اپنے کپڑوں کو بار بار دیکھ کر اتنا خوش تھے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی ساری مرادیں
برآگئیں ہیں غریب کو اگر پیٹ بھر دینی اور تن بھر کر اہل جائے تو وہ بے چارہ
سمجھتا ہے کہ اسے سب کچھ مل گیا۔ لیکن امیر " " " " امیر کو چھوڑے۔ وہ تو

اسی وقت خوش ہوتا ہے جب لاکھوں غریبوں کا حق یلوں اور فیملیوں
کے ذریعہ بخوڑنے کے بعد وہ چاندی اور سونے کی کئی کئی منترہ ستارے کھڑی کرتا
ہے۔ اصغر کے بچوں نے کھلونوں کو آج پہلی بار ہاتھ لگایا تھا۔ وہ ان کھلونوں
کو گود میں لئے لئے اچک اچک کر ادھر ادھر منستے پھر رہے تھے۔ اصغر اپنی
بیوی کے پاس بیٹھا بچوں کو اس طرح خوشیاں مناتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں
سے ٹپ ٹپ دو آنسو گرے۔ اپنی بیوی کے گلے میں باہیں ڈال کر اس نے کہا
"شکر ہے اس پروردگار کا جس نے ہمیں یہ دن دکھائے۔"

اگر دنیا میں انصاف کا ہول بالا ہو جائے تو کیا ہر غریب کو یہ دن نصیب
نہیں ہو سکتے۔ ؟ ؟ ؟

باب ۲۹

"دوسری دنیا کا ٹکٹ"

آخر کی ماں کو بند گاڑی میں ہسپتال لایا جا چکا تھا۔ یہاں وہ ہوش
میں آگئی تھی۔ "اے اُس کا بخار بھی کچھ کم ہو گیا تھا۔"

یہ پوچھنے کی بات نہیں کہ وہ اور اختر ایک دوسرے سے چپٹ کر کتنا رو
ہوں گے۔ اور بیجا ری غریب بڑھیا کتنی خوش ہوئی ہوگی جس کو اختر کے مل جانا
کی کوئی امید نہ رہی تھی۔

ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ بڑی بی بی کو الگ کمرے میں رکھا جائے لیکن
اختر کے کہنے سے انھوں نے اُن کو اختر ہی کے کمرے میں ہی رہنے دیا۔
اختر کی غریب ماں سید کمزور ہو چکی تھی اب اس میں رکھا ہی کیا تھا۔
بس بڑی اور چڑھ رہ گیا تھا۔

وہ اختر سے زیادہ بات نہ کر سکی اسلئے کہ ستوڑی دیر بعد اس کا بخار پھر
تیز ہو گیا تھا۔ اور اب وہ پڑی ہوئی برا رہی تھی۔
پریشان حال اختر اس کے سر ہانے بیٹھا رو رہا تھا۔ اس سے زیادہ
وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔

نرسیں اور ڈاکٹر بڑی بی بی کے چاروں طرف گھوم رہے تھے۔ کبھی سر پر
ہنر رکھتے کبھی حلق میں دوا پٹکاتے۔ غرض ہر طرح بخار کو اتارنے کی
کوشش کرتے۔ لیکن بڑی بی بی تھیں کہ دوسری دنیا کا ٹکٹ کٹانے پر اڑی
ہوئی تھیں۔

باب

”اے صاحب سولہ آنے لو“

یوسف اپنے کمرے میں گاؤ تکیہ سے ٹکا ہوا بیٹھا تھا حقہ کی نئے اسکے

منہ میں تھی۔ شہر کے چار چھٹے ہوئے غنڈے اس کے قریب بیٹھ بیڑی کے کش
کھینچ رہے تھے۔

یوسف: "تم لوگوں سے کچھ بنتا بنانا تو ہے نہیں۔ جب دیکھو روپیہ
لینے چلے آتے ہو۔"

ایک غنڈا: "اے صاحب اس دوزخ کو بھی تو آخر بھرنا ہے۔ روپیہ نہ لیں
تو کام کیسے چلے گا۔"

دوسرا: "جب وہ گھری سے نہ نکلے تو ہم کیا کریں۔"

تیسرا: "جس دن وہ ذرا بھی باہر آگئی بس اسی دن سمجھ لو، ہمارا کام ہو گیا۔"
چوتھا: "میاں کام ذرا سوچو۔ سمجھ کر بنا پڑتا ہے۔ اب آپ چاہو کہ ہم نقب لگا کر
سلطانہ کو کھٹالائیں تو یہ ذرا ٹیر بھی کھیر ہے۔"

پہلا: "(ہنس کر) کیوں نہیں اگر میاں پھر بتا دیں کہ ہمارے جیل جانے کے بعد
پانچ برس تک بال بچے قانون نہ کریں تو ہم یہ بھی کر سکتے ہیں۔"

دوسرا: "اجی نقب تو کیا۔ پیسوں کیلئے روپیہ کیلئے کے لئے بھی کیا بال بچوں کیلئے
تو ہم توپ کے اندر سے بھی اس کو کھینچ لائیں۔"

تیسرا: "کریں کیا؟ بال بچوں کو بھوکا مرنے نہیں دیکھا جاتا۔ ورنہ آج ہم چوری
کیوں کرتے۔ غنڈے کیوں کہلاتے۔ دو پیسے کیلئے اپنی جان خطرے میں ڈال کر

دوسروں کو اسلئے لڑکیاں کیوں بھگاتے پھرتے۔"

چوتھا: "میاں آپ اطمینان رکھو۔ سب کام ٹھیک بن جائے گا۔"
پس آپ تو اس وقت تھوڑے سے

یہ کہ وہ اس وقت کہیں اور ہی تھی۔ مہین مہین پھوارنے اسکے بالوں پر لا تھا۔
 موتی جھا دیئے تھے۔ باغ میں اُس کے آجانے سے
 اس دلفریب نظر کو چار چاند لگ گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی لمبی
 پوری ہو گئی ہو۔ لیکن باغ کی پھروں والی
 رٹ کے نیچے سے چند مہیا تک آنکھیں سلطانہ کو گھور رہی تھیں۔ اور
 اب تو ٹھٹھکنے قد والے تین ڈھاما بند بد معاش آہستہ آہستہ دبے پاؤں تختوں
 کی آڑ میں چھپے چھپاتے چلے آ رہے تھے۔ جب یہ سوچتے سوچتے چونک
 پڑتی تو وہ لوگ ٹھٹھک کر وہیں آڑ میں ہو جاتے۔ اور جوں ہی یہ گردن نہی
 کرتے اپنے خیالوں کی دنیا میں گم ہو جاتی وہ تینوں پھر اپنی جگہ سے آگے سرکے
 لگتے اور اُس کے قریب تر ہوتے جاتے۔ اب تو ایک بد معاش اس سے صرف چند
 گز کے فاصلہ پر رہ گیا تھا۔ یکا یک سلطانہ نے انگڑائی لی۔ آہٹ پا کر وہ ہلٹ کر
 دیکھنا ہی چاہتی تھی کہ اُس بد معاش نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس کے منہ پر
 کپڑا کھدیا۔ وہ جھلی کی طرح تڑپ گئی۔ اس آفت نالہانی سے جھٹکا۔ ا
 پانے کے لیے اس غریب نے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن بیسود۔ چلائی بھی تو کیسے
 منہ میں کپڑا اٹھنا ہوا تھا۔

الغرض چشم زدن میں یہ تینوں بد معاش اُسے اٹھا کر باغ سے
 نیچے اتر گئے۔

باب ۵۲

”وَعْدَهُ كَيْحَبَسُ“

اب اختر بالکل اچھا تھا۔ آج اُس کی ماں کا شمار بھی اُتر گیا تھا۔
لیکن کمزوری زیادہ تھی اسوجہ سے دو تین روز کے لیٹے یہ لوگ ہسپتال میں
اور بٹھ گئے تھے۔

آج اختر کی آنکھ جلدی ہی کھل گئی تھی۔ مسخہ ہاتھ دھو کر وہ میدان
کی ہری ہری دوپ پر اُٹھ آیا تھا۔ کہ کچھ سے لسی نے کہا۔
”آداب عرض ہو اختر صاحب“

اختر نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے وہی حضرت یوسف صاحب کھڑے
تھے جن کی مہربانی سے اختر زخمی ہوا۔ دریا میں پھینکا گیا۔ وہ تو کہوٹرا بن کر
ترس آ گیا۔ جو اُس نے ایک دقیقہ یوسفی ڈونگے میں اسے پٹخ دیا۔ ورنہ اہل
تو یہ خدا کی ہاٹ پوٹ لیا ہوتا۔ اختر کی نظر اسوقت یوسف کے چہرے پر
تھی اور اسکا دماغ جلدی جلدی وہ تمام پچھلے واقعات یاد کر رہا تھا جن کی
بدولت وہ اس ہسپتال میں کئی دن سے پڑا تھا۔

یوسف (مسکرا کر) اختر صاحب میں آپ کے معافی مانگنے حاضر ہوا تھا۔ بات
یہ تھی کہ اُس دن پہلے سے میں نشہ میں تھا۔ اُس کی دھن میں کچھ ایسی کہیں
کر گیا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھیں۔ بعد میں میں لپٹا بچھتا یا آپ کو کیا بتاؤں۔

خطا انسان ہی سے ہوتی ہے۔ اور صاف دل اُسے معاف بھی کر دیا کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہو کہ میرا جرم اتنا بڑا ہے کہ میں آپ کے آنکھ ملا کر بات بھی نہیں کر سکتا۔ میری گردن ندامت سے جھکی جا رہی ہے۔

اختر صاحب۔ میری خطا قابل معافی تو نہیں ہے لیکن لیکن مجھے آپ کے اُمید ہو اگر آپ مجھے معاف کر دیں گے تو میرے دل و دماغ سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ جائے گا۔ جس کے نیچے میں پسا جا رہا ہوں۔ سلطانہ سے بھی معافی مجھے مانگنی ہے۔ بہر حال اگر آپ لوگ میرا قصور سچے دل سے معاف کر دیں تو مجھ پر بڑا احسان ہو گا۔ اختر صاحب کیا آپ اس لکھنگارہ کو معاف کر سکیں گے؟

اختر یوسف کے منہ سے اتنی باتیں سن کر کچھ پریشان سا ہو گیا ایک منٹ تک وہ زمین کو گھورتا رہا۔ کیا جواب دے۔؟ آخر کار اُس نے گردن اٹھائی۔

اختر (مسکرا کر) یوسف صاحب آپ نے میری جان لینے میں تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بہر حال جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے معاف کیا۔ لیکن یوسف۔ (اختر کا شانہ چھو کر) میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ (کچھ سوچ کر) کوئی حرج نہ ہو تو کچھ عرض کروں۔ اختر۔ ”فرمائیے۔“

یوسف:- سلطانہ اور آپ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔؟
اختر نے یوسف کی طرف دیکھا۔

یوسف (مسکرا کر) آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اب میں آپ دو بیٹوں کی اس محبت سے ناخوش نہیں ہوں۔

اختر: آپ کا مطلب کیا ہے؟

یوسف: میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ یہ میں جانتا ہوں کہ میں آپ کے لئے کتنا ہی کچھ کر جاؤں لیکن میری آنکھیں آپ کے سامنے سچی رہی ہیں گی۔
اختر: (مسکرا کر) کس قسم کی مدد آپ میری کرنا چاہتے ہیں؟

یوسف: یہی کہ بس۔ دو بیٹوں کو ملا دوں۔ یعنی۔۔۔ یعنی کہ شادی۔ ہاں خوب یاد آیا۔ پرسوں میرے یہاں جلسہ ہوا تھا جسے ہمیشہ کی سالگرہ کے سلسلہ میں۔ آپ ضرور تشریف لائے گا۔ اس عرصہ میں میں سلطانہ سے بھی مل لوں گا۔ اگر وہ بھی من گھڑی۔ تو ممکن ہے کہ وہ بھی آجائیں۔ آپ سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور۔۔۔۔۔ دیکھئے ضرور تشریف لائے گا اختر صاحب۔

اختر: (مسکراتے ہوئے) کوشش کروں گا۔

یوسف: اگر آپ نہیں آئے تو میں ہی سمجھوں گا کہ آپ کے سچے دل سے مجھے معاف نہیں کیا۔ وعدہ کیجئے۔

الغرض یوسف نے اختر سے جلسے میں شریک ہونے کا پکا وعدہ لے ہی لیا۔ اختر نے بھی سوچا۔ چلو اس ہانے سے سلطانہ سے ملاقات ہو جائے گی۔ اس سچا پکے کو کیا خبر کہ یوسف صاحب اس کو جلسے میں کسوا سٹے

لائے ہیں۔

باب ۵۳

”بنگلے میں آگ“

دریا کے کنارے ایک جھوٹے سے بنگلے سے کسی عورت کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ چھریاں دکھا دکھا کر اسے خاموش کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ لیکن سلطانہ کو اب اپنی جان کی مطلق پروا نہ تھی۔ وہ اپنی زندگی سے تنگ آ چکی تھی تو بھلا ان بد معاشوں کی چٹریوں سے کیا ڈرتی۔ اس کے ہاتھ پر سی سے کسے جا رہے تھے اور یہ ٹرپ ٹرپ کر اپنے کو چھڑانے کی بیکار کوشش کر رہی تھی۔ بیکار دروازے کو کسی نے زور سے ٹھونکا۔ اس میں سے ایک بد معاش نے پہلے طعنے کی سے جھانک کر دیکھا کہ آئینہ والا کون ہے۔ پھر ایک سوکھا سا ہتھ لگا کر دروازہ کھول دیا۔ اور یوسف پھرے پر ڈھکنا بازو سے ہوسے اندر داخل ہوا۔

”ایک بد معاش (دہنکر) شکار حاضر ہے۔“

یوسف نے دروہوں کی تفصیلی بد معاشوں کو دیتے ہوئے آواز بنا کر، بس اب تم لوگ جاؤ۔ میں اس کو سمجھ لوں گا۔“

دوسرا بد معاش: ”پھر نہ کہے گا کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔“

تیسرا بد معاش: ”جائے ہوئے نہیں کر، اچھا خدا حافظ۔ اب میرے اڑے آپ کو۔“

پوچھتا : " چلو چلو - شیر گارے پر ہے "۔

ان چاروں کے جانے کے بعد یوسف نے اندر سے دروازہ

بند کر لیا ۔

سلطانہ دیکھ کر، تم کون ہو؟

یوسف : " (آواز بنا کر) خاموش "۔

یہ کہہ کر اس نے بیچاری بندھی بندھائی سلطانہ (جو ایک ٹوٹے ہوئے

پنکاب پر پڑی تھی) کی آنکھوں پر احتیاطاً اپنا رومال نکال کر پٹی باندھ دی
اور کرخت لہجہ میں بولا - اُف . فوہ ، کتنے کپڑے ہیں رکھے ہیں تو نے ۔ مجھی کو

اُتارنا پڑیں گے یہ سب ڈاچھا ۔

سلطانہ : " الگ ہو ۔ ۔ ۔ دور بیٹ ۔ میرے جسم کو ہاتھ نہ لگا کہنت "۔

یوسف : " ذرا کھڑ جا "۔

سلطانہ : " خدا کی واسطے کیا کرتا ہے منحوس ۔ ۔ ۔ کون ہے تو ۔

کہنے ۔ ۔ ۔ میرے کپڑے کیوں اُتار دے لیتا ہے ۔ ۔

او خدا یہ کیا ہوتا ہے "۔

یوسف : " ذرا چپ کی تو رہ "۔

سلطانہ : " یہ نہیں نہیں ۔ ۔ ۔ ارے نہیں ۔ ۔ ۔ مجھے نزکا

کے ڈالنا ہے او منحوس ۔ ۔ ۔ دور ہو ۔ ۔ خدا میں مری

بچالے ۔ بچالے ۔ میری عزت ۔

یوسف (ہنس کر) اندر سماں مجھ سے ڈرتے ہیں ۔ یہاں نہیں آئیں گے ۔

دفعاً دھڑام سے ایک آواز نہ ہوئی۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے کوہِ دکر نقاب پوش ہاتھ میں سپتول لیے یوسف کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے اسپتال میں سیٹھ محمود کو سلطانہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے (کھڑکی سے سر نکال کر) دیکھا تھا۔ جس نے اصغر کو اسپتال سے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ جس نے کھڑکی سے پرچہ پھینک کر سلطانہ کو اس کے دشمنوں سے خبردار کیا تھا۔

”ہاتھ اونچے کرو،“ نقاب پوش ڈپٹ کر بولا۔ ”ورنہ یاد رکھو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔“

یوسف نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اونچے کر لیے۔ اور ڈرتے ڈرتے پوچھا: ”تم کون ہو؟“

نقاب پوش نے اس کے جواب میں سیٹی بجائی۔ فوراً ہی ایک ڈھاٹا بند اسی کھڑکی سے کوہِ دکر اندر آیا۔ نقاب پوش یہ دیکھو اس بو کی کو کھول لو۔ اور سوڑ میں بھٹ کر اس کے مکان پر چھوڑ آؤ۔ لیکن یاد رکھو اس کے کسی سوال کا جواب نہ دینا۔ اور اسے چھوڑ کر فوراً واپس چلے آنا۔“

جب سلطانہ کے ہاتھ پیر کھول کر وہ ڈھاٹا بند اسے لیکر باہر چلا گیا تو نقاب پوش یوسف کی طرف مخاطب ہوا۔ اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔“

یوسف خاموش رہا۔

نقاب پوش نے پھر سیٹی بجائی اور ایک دوسرا ڈھانا بند آدمی اندر آیا۔

نقاب پوش :- ”یہ رستی جو پڑی ہوئی ہے۔ اس سے ذرا کس توڑا لیں۔ اور یہ پھت میں جو کڑا لٹک رہا ہے۔ بس اسی میں انھیں لٹکا دینا۔ اسکے بعد نیگلے میں لگ جائے۔“

باب ۵۴

”کون؟ — اصغر؟“

نرائن دریا کے کنارے کسی گاؤں میں رہتا تھا۔ اصغر اسی گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ نرائن نے اگر آج بھی نہ بتایا کہ اختر کو اس نے کہاں بھوڑا تھا تو پھر اس کی (نرائن) کی خیر نہیں۔ وہ جو رکابچہ آنا پئے گا کہ اس کی بڑیاں اور پسلیاں بھی برابر ہو جائیں گی اور اگر سچ سچ بتا دیا۔ اس سے تو پھر تو۔۔۔ اس کو انعام دیا جائے گا۔ پانچ روپے میں تو اس کی بیٹی نکل آئے گی۔ پھر نہ جانے کیا کیا بلکہ اس کو لے لے گا بڑا باتونی ہے۔ نہ بان بھی میڑھی ہے اس کی۔ ایک سانس میں خبر نہیں کیا کیا کہہ جاتا ہے۔

اصغر مسکرا دیا۔ دریا کے کنارے کتا رہے اس قسم کی باتیں اپنے

دل سے وہ کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ جوں ہی وہ دریا کے ساتھ مڑا اس کی
نظر سامنے والے جلتے ہوئے بنگلے پر پڑی۔ جب یہ بنگلے کے قریب پہنچا
تو کھلے ہوئے دروازے سے اُس نے دیکھا کہ کوئی شخص سبکیسی کے عالم میں
شعلوں سے بڑی طرح لڑ رہا ہے۔ بندھے ہوئے کی وجہ سے اپنی چھتہ سے
ہل نہیں سکتا۔ وہ وہیں کی وجہ سے اصغر یوسف کو پہچان نہ سکا۔ ورنہ
اب ان کا پہچان لینا کوئی مشکل نہ تھا۔ کیونکہ اس کا ڈھانڈا مناسب
کھل کھلا لیا تھا۔

کڑے کے قریب کی رستی چل جانے کی وجہ سے یوسف ترسیں پر
گھر پڑا تھا۔ جہاں پڑا پڑا وہ آگ کی بڑھتی فوج کو مایوس نگاہوں سے دیکھ

اصغر لکپ کو بجلی کی طرح کمرے میں گھس گیا اور دو منٹ بعد شعلوں
کی لپٹ سے بچتا بچتا وہ یوسف کو باہر نکال لایا تھا۔
”اوہو یوسف صاحب ہیں“

اصغر نے مسکراتے ہوئے کہا : کہئے یہاں کیسے آن پھنسے ؟

یوسف نیم سہوش سا ہو رہا تھا بولا : کون ؟ ۔ ۔ ۔ اصغر ؟

”جی ہاں میرے محسن۔۔۔“ ”بندہ اقصیٰ ہی ہے۔“

”شکر یہ بھیٹی، اچھا تم جاؤ۔ میں چلا جاؤں گا۔“

... بہتر ہے لیکن کیا پس لوچھ سکتا ہوں ... قصہ کیا تھا ...

دو نہ جانے کون سورا کا بچہ عقا۔۔۔۔۔ اچھا تم جاؤ۔

پھر کسی قبت ملنا تو بتاؤں گا۔ یہ قصہ
اصغر نے زور کا ایک سوکھا سا ٹھٹھہ لگا یا اور سیٹی بجاتا ہوا
چل دیا۔

باب

”وہم اور کون؟“

اختر کو یوسف نے اپنے گھر کا پتہ بتا ہی دیا تھا۔ چنانچہ اختر اپنے
دعے کے مطابق ہسپتال سے یوسف کے مکان پر جا پہنچا۔ جلسے میں
شرکت کرنے اور پھر یوسف جیسے شریف آدمی کے یہاں تو وہ کیا آتا۔
لیکن سلطانہ سے ملاقات کا خیال اسے یہاں کھینچ لایا تھا۔
اختر ایک سیدھا سچا انسان تھا۔ اس کو سان و گمان بھی نہ تھا کہ
یوسف اس سے پھر کوئی چال چلنا چاہتا ہے۔

یوسف نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اس قدر خاطر مدارات کہ سب

بچھا جا رہا تھا۔
یہاں آکر اختر کو معلوم ہوا کہ جلسہ تو کسی وجہ سے دو تین روزہ کو ملتوی
ہو گیا ہے (جس کی اطلاع یوسف اختر کو نہ کر سکا تھا)۔ لیکن اس وقت
وہ بغیر کھانا کھائے نہیں جاسکتا کیونکہ یوسف نے خاص طور سے کئی چیزیں

اس کے لئے پکوائی ہیں اور سلطانہ کو بھی بلا بھیجا ہے۔ شاید وہ بھی آتی ہی ہوں گی۔
سلطانہ کے آنے کی خبر سنکر اختر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ خیالوں
کی دنیا میں گم سم ہو کر بیٹھ گیا۔

بڑی دیر ہو گئی اور سلطانہ نہ آتا تھی نہ آئی۔ یوسف نے تو اختر کو روکے
سیٹے جھوٹ بولا تھا کہ اُس نے سلطانہ کو بلا پایا ہے۔

بہر حال دسترخوان سجھا اور بڑا پُر تکلف کھانا چٹا گیا۔ یوسف اور
اختر کے سوا کمرے میں کوئی نہ تھا۔ کھانے پر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔
لیکن اختر کے کان آہٹ پر لگے ہوئے تھے کیوں؟ یہ آپ جانتے ہیں کھانے کے بعد
یوسف دو سکر کمرے میں (جواب سڑک تھا) پاں لینے چلا گیا۔ منبر کی
کھول کر اس نے چھوٹی سی قینچی اور ایک موٹا سا سفید بال نکالا اور اس
بال کو مہین مہین کر کے مسکراتے ہوئے ایک موٹے سے پان میں رکھ کر لو لگ
لگا دی۔ قینچی کو واپس دراز میں رکھا۔ پھر تھالی میں دو پان وٹھکر ایک
بڑا لونگ والا وہ آئینہ کے سامنے اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔ کھڑکی کی
طرف کوئی چیز ہلتی نظر آئی۔ یوسف گھبرا گیا۔ .. کون ہے؟ ..
پھر خود ہی مسکرا دیا۔ وہم اور۔۔۔ کون ہے؟

ایک منٹ بعد یوسف پانوں کی تھالی سے پورے اختر کے پان
پونچا۔

”بیٹے اختر صاحب! پان ملاحظہ فرمائیے۔“

قبل اس کے کہ اختر چھوٹا پان اٹھائے یوسف اسے چھوٹے پان کو

اپنے منہ میں رکھ چکا تھا۔ اب مٹھالی میں یہ لوگ ڈالا ہوا پان ہی رہ گیا تھا۔
جبیں یوسف نے شیر کی مونچھ کا بال کتر کے ڈالا تھا۔ یہ ایک خطرناک
سلو پائٹرن تھا کہ سال بھر کے اندر انسان ختم ہو جاتا ہے۔

الغرض اختر نے اس زہریلے پان کو اٹھا لیا۔ لوگ نکالی اور
چاہتا تھا کہ منہ میں رکھ لے کہ دفعتاً اس کمرے کا پردہ ہٹا جہاں سے یوسف
پان لینے گیا تھا اور کسی نے زور سے چلا کر کہا: ”خبردار۔ پان ہرگز نہ کھانا“
یوسف اور اختر دونوں کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں، وہی نقاب پوش
جس نے سلطانہ کو یوسف سے بچایا تھا۔ سٹپل ہاتھ میں کئے کھڑا بیچ رہا
تھا۔ اس پان کو سوائے یوسف صاحب کے اور کوئی نہیں کھا سکتا۔
یوسف گھبرا گیا اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔

”خبردار۔ ہاتھ اٹھاؤ“

پستول کی مال اپنی طرف دیکھ کر یوسف نے جلدی سے اپنے ہاتھ

اوپر کیے۔

نقاب پوش (ذورے) اختر صاحب۔ پان کو ان کے منہ میں دیا بیچے۔

”جلدی۔“

اختر بیچارہ ہکا بکا ہو رہا تھا۔ ہر حال اس کو حکم کی تعمیل کرنا پڑی

پان کو وہ یوسف کے منہ کے قریب لے گیا۔

نقاب پوش (یوسف کو گلیرتے ہوئے) ”منہ کھولو۔ لیکن یوسف کا منہ

بند تھا۔

نقاب پوش دستوں ہلا کر زندہ ناتے ہوئے منہ کھولو۔ منہ کھولو اور نہ۔“
 یوسف نے فوراً منہ کھول دیا۔ اور اختر نے پان اسکے دانتوں کے سپرد کیے
 ”چباؤ“ نقاب پوش زور سے گرجا چباؤ اور جلدی نکل جاؤ۔“
 القصدہ بیچارے یوسف صاحب کو پان کسی نہ کسی طرح حلق کے نیچے اٹا رہا
 ہی پڑا۔

نقاب پوش (تمقہ لگا کر) اچھا اختر صاحب۔ اب آپ یہاں سے ر فوج کر رہے ہیں
 اور خبردار اس شیطان سے اب کبھی نہ ملے گا۔ پان میں زبردے رہا تھا آپ کو؟
 اختر یوسف کو کھول کر نقاب پوش سے (شکر یہ) کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔۔۔“
 نقاب پوش (بات کاٹ کر) نہیں۔ (اشارہ کر کے) بس آپ کا وہ راستہ ہے۔“
 جب اختر چلا گیا تو نقاب پوش نے ایک فرمائشی تمقہ لگایا۔
 ”اپنی بناؤں کا خود شکار۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔ ہی ہے۔“
 یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹا اور کھڑکی باہر پھلانگ لگا کر یہ جاؤ جاؤ۔“

باب ۵۶

”وہ سوچنے لگا۔“

نقاب پوش پھونس کی ایک چوٹی سی جھونپڑی میں بیٹھا ہوا اس خط کو دوبارہ
 پڑھ رہا تھا جو اس نے ابھی ابھی لکھ کر تیار کیا تھا۔

مذقاب پوش کون ہے۔ اب اس کو سب پتہ لگ چائے گا اس نے
 مسکرا کر دل میں کہا اور خط کو لفافہ میں بند کر کے لفافہ پتہ سلطانہ لکھ دیا۔
 نفیس کے ہاتھوں بھینچوں یا خود دے جاؤں۔ وہ سوچنے لگا۔ نہیں میں
 خود ہی جا کر اس کی کھڑکی میں پھینک آؤں گا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ جھونپڑی سے
 جھانک کر باہر دیکھا اور کسی کو جانادیکھ کر جلدی سے اندر ہو گیا۔ دو منٹ
 خاموش کھڑے رہنے کے بعد پھر جھانک کر دیکھا اور جب اطمینان ہو گیا تو
 جھونپڑی کے باہر آکر آہستہ سے دروازے کو بند کیا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا
 ایک طرف کو چل دیا۔

باب

”یہ گل جھڑے“

خود کا تیار کر وہ زہر یوسف کے پیٹ میں جا چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ
 ایک سال کے اندر گل گل کے وہ ختم ہو جائے گا لیونکہ شیر کی موشچھا اپنا اثر
 دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ گڈھا کھروا تھا کہ بہت دور سے کیلئے اور گڑھے

خود ہی اونڈیے منہ آیتا

”مرنا تو اب لیکن اس کمبخت نقاب پوش کو مڑا چکھا ہے۔ ہور گا۔ بیچ
 میں کون شیک پڑا آؤ گا پھار۔“ لیکن کیا ایک سال بعد میرا ٹھکانہ

اسکا اتنا بتا تھا کہ یوسف نے تڑپے فیر کیا۔ اور حسن آرا اپنا سینہ کاٹ کر ایک دردناک
آہ کیساتھ زمین پر آ رہی۔ سیٹھ ہزار می لال ایسے زور سے اچکے جیسے گولی انھیں
کے لگی ہو۔

اب ہزاری لال کی باری تھی یوسف کے دوسرے فیر میں وہ بھی اوندھے
منہ قریب کی کرسی پر جا پڑے۔
دو خون کرنے کے بعد یوسف پر بری طرح خون چڑھ گیا اور سستول
کو ہاتھ میں لئے وہ بھوکے شیر کی طرح باہر نکل گیا۔

باب ۵

”اب میں چوری سے توبہ کر چکا ہوں“

جو نہی سستول ہاتھ میں لئے یوسف حسن آرا کے گھر سے باہر آیا اس کی نظر
گلی میں کسی کالی کالی چیز پر پڑی جو دیوار سے ملی ہوئی سرک ہی تھی۔ غور سے دیکھنے کے
بعد یوسف نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی کمبخت نقاب پوش تھا جس نے سلطانہ کو
اسکے پھندے سے چھڑا کر اس کو د یوسف کو الٹا لٹکانے کے بعد نینگلے میں آگ لگوادی
تھی۔ یہ وہی منحوس شخص تھا جس نے اختر کو پان کھانے سے روکا تھا اور پھر وہ
زہر کا بکھا ہوا پان اسی کے ہاتھ اس کے منہ میں کھسوا دیا تھا۔ یوسف نے عجیب
قسم کی ایک خوشی محسوس کی۔ یکایک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ بدلہ

لینے کا اس سے بہتر کون سا موقع ہو سکتا تھا۔ کہیں شکار ہاتھ سے نکل نہ جائے۔
 انخر اور سلطانہ کے رفیق۔ اب اپنے کئے کی سزا بھگت۔ یوسف نے جھپٹ کر
 نقاب پوش پر یکے بعد دیگرے دو فیر کر ڈالے۔ بیچارے نقاب پوش کا فیصلہ
 تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اور اب وہ غریب زمین پر پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا۔ آخری
 الفاظ جو اس کے منہ سے نکلے یہ تھے۔ ”دھوکے باز اسکا بدلہ مجھے جلد ہی مل جائیگا۔
 چاروں طرف سے شور و غل کی آواز سن کر یوسف کھبرا گیا۔ ہر طرف سے
 لوگوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ گویا اس گلی میں وہ بند ہو کر رہ گیا تھا۔
 اس نے تین خون کئے تھے۔ اب وہ کیا بچ سکتا تھا۔ پولیس۔۔۔ ا پھانسی کا
 تختہ۔۔۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے پستول میں ایک
 گولی اور بچی تھی۔ نہیں اب دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی تھی۔ اور
 شیر کی مونچھ کا بال بھی تو وہ کھا چکا ہے۔ گویا اس کی زندگی تو اب ختم ہو ہی چکی
 ہے۔ کیا وہ پھانسی کے تختہ پر چڑھنا پسند کر لگیا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ پستول کو اُس نے
 اپنی کینٹی پر رکھ لیا۔ آنکھیں بند کیں۔ دانت بھیچے اور بلبلی دبا دی۔
 اب یوسف کی لاش بھی نقاب پوش کی لاش کے قریب پڑی ہوئی
 تڑپ رہی تھی۔

جمع کو چہرہ پھاڑتا آصف بھی کہیں سے آپوٹیا اور جیسے ہی مردہ نقاب
 پوش کی نقاب اُس نے اسکے چہرے پر سے ہٹائی۔ آصف کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔
 ”کون؟ دلاور“

آصف نے اپنی آنکھیں دانتوں میں لے لی۔ ہائیں یہ تو مر چکا تھا یہ تو بقیہ

آنسوؤں کی اس وادی میں اس دنیا میں ایک ایک لمحہ اُس کے لئے سال بھر سے کم نہ تھا۔
 وہ تنگ آگئی تھی۔۔۔۔۔ تنگ آگئی تھی۔۔۔۔۔ اپنی زندگی سے۔
 آج اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اندھیرا ہوتے ہی اپنے باغ کی پشت والی
 ندی میں ڈوب کر وہ اس دماغی کوفت سے کسی طرح اپنا تپ چھا پھرائے گی۔ اب
 اندھیرا ہو چلا تھا۔ اپنے والدین کے نام آخری خط لکھنے کے بعد اسے اپنے تکیہ
 کے نیچے رکھ کر وہ گردن جھکائے آہستہ آہستہ ندی کی طرف چلی جا رہی تھی۔

باب ۶۰

”کہاں تھے آپ؟“

اختر اپنی ماں کو لیکر آج ہسپتال سے گھر آگیا تھا۔ یہ اس وقت باز اری سے کچھ لینے
 کیلئے آیا تھا کہ دور سے شور و غل کی آوازیں سن کر یہ اس طرف بڑھا۔ آخر قصہ کیا ہے؟
 بیچ میں ایک پہلی سی گلی تھی۔ اختر تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ گلی کے موڑ پر زور سے اُس کی
 مگر ہوئی۔

”دھیکر نہیں چلتے آپ؟“ کسی نے کہا۔

”دونوں ٹھٹک گئے۔“

”اختر صاحب؟“ — آپ ہیں؟ ”بھئی خدا کی قسم“ اصغر کے منہ سے نکلا۔
 اصغر خوشی کے مارے بُری طرح اختر سے لپٹ گیا۔ میں نے آپ کو سائے میں بٹھوایا۔

کہاں کہاں کے کنوؤں میں میں نے بانس نہیں ڈالے آپ کے لیے۔ مکان پر تو آپ کے تالاب پر ہے
خیر۔ خدا کا شکر ہے آپ زندہ ہیں۔ مجھے یقین تھا۔ کہاں تھے آپ؟
اختر نے اصغر کو گھور کر دیکھا اس سے پہلے اختر نے اسے صرٹ دو مرتبہ دیکھا
تھا۔ پہلی دفعہ دلاور کے ساتھ تھیٹر میں اور دوسری مرتبہ یوسف کے ڈیرے میں۔
اصغر سمجھ گیا۔ اس نے کہا: آپ میری اس بے تکلفی پر دل ہی دل میں ہنس رہے
ہوں گے۔ میرا نام اصغر ہے۔ آپ کی سلطانی کو یوسف صاحب کے بھندے سے اسدن
اسی خاکسار نے چھڑایا تھا۔ سلطانی سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ آپ کو ڈھونڈھ کے
رہوں گا۔

اختر: دوا اچھی تو ہیں وہ؟

صنغر: بالکل اچھی ہیں مگر آپ کیلئے پریشان۔۔۔۔۔

اختر: دھندلی سانس لیکر، پونچھ۔۔۔۔۔ یہ ادھر گڑ بڑ کیسی ہو رہی ہے؟

اصغر: (جی کچھ نہیں۔ آپ تو میرے ساتھ آئیے۔ سب بتا دوں گا میں آپ کو۔)

پہلے آپ تو یہ بتائیے کہ آپ تھے کہاں؟ اس کے بعد آپ کے دشمن جان یوسف صاحب

کا سارا قصہ سناؤں گا آپ کو۔ یہ گڑ بڑ بھی اسی سلسلہ میں ہے۔ یوسف صاحب نے

دلاور کو مار کر خودکشی کر لی ہے۔

اختر: کیا؟ — یوسف نے خودکشی کر لی۔؟ اور دلاور کو مار کے۔؟ کون دلاور؟

اصغر: وہی دلاور جس کو حبشی کھا گئے تھے۔؟

اختر: کیلئے ہوئے؟

اصغر: میں سچ عرض کر رہا ہوں۔ یہ خط اس کی جیب سے نکلا ہے شاید یہیں اس کے متعلق

کچھ تفصیل ہو۔ بہر حال یہ سلطانہ کے نام کا ہے۔ اسکو وہی کھولیں گی دانش کا ہاتھ
 پھر کر چلتے ہوئے، ہاں اب آپ اپنا قصہ کہئے؟
 اختر ایک منٹ تک ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ اس کے بعد مختصراً اُس نے
 ران میں گولی لگنے کے بعد سے اپنی کہانی، اصغر کو سنا دی۔
 اصغر کو خود پر بڑا غصہ آیا کہ ایک ہی اسپتال میں ہو کر یہ اختر کا پتہ
 نہ لگا سکا۔

اصغر: "اس وقت میں آپکو سلطانہ کے یہاں لئے جا رہا ہوں۔ وہاں چل کر ذرا
 دلاؤرے اس خط کو بھی سن لیں گے۔ کوئی کام تو نہیں ہو آپ کو؟"
 اختر: "نہیں کوئی خاص کام تو نہیں ہو۔ لیکن۔۔۔۔۔"
 اصغر: "لیکن ویکن کچھ نہیں۔ پس چلتے۔ وہ انتہائی پریشان ہیں۔ آج خوش
 ہو جائیں گی۔ آئیے۔ مرحوم یوسف کی حرکتیں بھی سناؤں گا۔ آپ کو استے ہیں۔"

باب ۶

”رانی گھاٹ“

ندی کے کنارے والی ٹھنڈی سڑک کو پار کر کے سلطانہ ”رانی گھاٹ“
 پر پہنچی۔ اب وہ گھاٹ کی سڑکیاں اترتی چلی جا رہی تھی۔ رکنے ہوئے صاف
 وشفاف پانی میں اب وہ اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ اس جگہ ہاتھی ڈباؤ پانی بھتا۔

بہنیں ہیں سے کود پڑوں۔ نہیں دوسٹر ہیاں اور۔۔۔۔۔
 کھٹ، کھٹ، بس اب ٹھیک ہے۔ آنکھیں نکال کر اس نے پانی کو دیکھا۔
 ”مجھے جانتا چھوڑ کر اتنی جلدی سو گئے تھے۔۔۔ اس پانی میں۔۔۔
 جاؤ اب میں بھی پیٹھ موڑ کر سو جاؤں گی۔ وہ عجیب طرح سے مسکرائی۔
 نہیں نہیں، خفا نہ ہو۔ میں سو گئی نہیں۔ میں آرہی ہوں تھیں جگائے
 سمجھے۔۔۔۔۔“

سلطانہ نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ ایک نظر آسمان پر ڈالی۔ زور سے
 ہنسی اور پیر باندھ کر ندی میں کود پڑی۔
 زور سے دھماکے کی آواز ہوئی۔۔۔۔۔ لیکن دوسکنڈ بعد

ایک دھماکہ اور ہوا۔
 اصغر رانی گھاٹ پر کھڑا ہوا آنکھیں کھلا کر ندی کی طرف
 دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اصغر اور اختر دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے
 چلے آ رہے تھے۔ انھوں نے ایک عورت کو پانی میں کودتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔
 لیکن وہ اس کو پہچان نہ سکے تھے۔ اندھیرے میں صرف انھوں نے اتنا دیکھا
 تھا کہ وہ ساری باندھے ہوئے تھی۔ اختر نے فوراً پانی میں چھلانگ لگائی
 لیکن چونکہ اصغر کو تیرنا نہیں آتا تھا اس لئے گھاٹ پر گھرایا ہوا کھڑا وہ پانی کو
 گھور رہا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اختر اور وہ عورت دونوں ڈوبا
 رہے ہیں۔ اصغر سے نہ رہا گیا۔ کوٹ اٹا کر سیڑیوں پر پھینکا اور بغیر سوجے سمجھے
 دھڑام سے پانی میں کود پڑا۔

”ہن سلطانہ“۔ نقاب پوش کے متعلق تم نہ جانے کیا کیا سوچ رہی ہو گی یہی کہ یہ بچہ کون ہے؟ اسکو کیا پڑی جو میری اس طرح مدد کرتا پھرنا ہے؟ تمہیں کیا خبر کہ یہ وہی بدکار دلاور ہے جو اپنی کم عقلی کی وجہ سے ایک دن تمہارے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ ہن سلطانہ میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔ ہر گز جو تمہاری معافی مانگتا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ خدا سے تو معافی مانگ چکا ہوں لیکن تم جب تک معاف نہ کرو گی خدا کبھی معاف نہیں کر سکتا میں جانتا ہوں تم کہتی ہو گی۔ دلاور نے یہ پلٹا کیسے کھایا۔ تمہیں اس وقت سخت تعجب ہوا ہو گا کہ بھلا آدم خوروں کے پیٹ سے دلاور زندہ ہو کر کیسے نکل آیا۔ تم لوگ تو سب کے سب مجھے مردہ ہی سمجھ رہے ہو۔ بہر حال ستویں اقصیٰ۔

جب ان حبشیوں نے میرے کپڑے اُتار کر سر سے اُتر چکا اٹھالیا اور کڑواؤ کے قریب لے گئے تو میں نے خدا کے برگ و برگ سے گڑ گڑا کر دعا مانگی اور وعدہ کیا کہ اگر اس وقت تو مجھے بچائے تو میں نہ صرف اپنی بری عادتوں کو چھوڑ دوں گا بلکہ ان لوگوں کی مدد کرتا رہوں گا جو تکلیف میں ہوں۔ میں جانتا تھا کہ یہ عذاب تمہاری بدعا کا نتیجہ ہے۔ اللہ نے میری سن لی۔ اور وہ لوگ تم دونوں کو کسی دوسری طرف لے گئے اور ہر اس خوفناک بیڈھنگے حبشی نے نہ جانے کیا سوچ سمجھ کر مجھے زمین پر ٹپکتے یا۔ اور میری جگہ میرے ایک دوسرے ساتھی تلیر کو (جو مجھ سے زیادہ بگڑا تھا) اٹھا کر کڑواؤ میں پھینک دیا۔ گویا اس دن میری باری ٹل گئی تھی۔ پھر انھوں نے مجھے ایک تھوپیڑی میں بند کر دیا۔ جب رات کو یہ لوگ تاڑی پی پی کر بہوش ہو گئے تو میں بھی وہاں سے کسی طرح نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد سے تمہاری اور اختر کی کچھ یوں ہی سی خدمت کر کے گناہوں کی تلافی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن

جب تک تم لوگ دجن کی بزمی اور مصیبت کا بانی سوائے میرے اور کون ہو سکتا ہے
 سچے دل سے مجھے معاف نہ کرو گے۔ جیتے جی مجھے چین نصیب نہ ہو سکے گا۔
 بہن سلطانہ میں یہ خیال کر کے کانپ اٹھتا ہوں کہ میں نے تمہیں ہرباد
 کرنے میں کون سی کسر اٹھا رکھی تھی۔

بہر حال اب میں نے توبہ کر لی ہے اور خدا گواہ ہے کہ میں نے یہ سچے دل سے
 کی ہے۔ اب تم میری بہن ہو۔ میری بہن کیا تم مجھے معاف کر دو گی۔ اگرچہ
 میں اس قابل تو نہیں ہوں۔

تمہارا گنہگار بھائی

دلاور

خط پڑھنے کے بعد سلطانہ نے کچھ سوچتے ہوئے اپنے دل میں کہا۔ دلاور میں نے
 تجھے معاف کیا۔ خدا بھی تجھے معاف کرے۔ وہ زمین کو کھود رہی تھی۔ لیکن
 یوسف کو میں کبھی معاف نہیں کر دوں گی۔

باب ۶۳

”بڑی بی رو پڑین“

سلطانہ کو دلاور کا خط پڑھے آج کئی سال گزر چکے تھے۔ ... اب آخر
 شہر کا مشہور بیرونی سردار اور افریقہ میں ہندوستانوں کا سب سے بڑا لیڈر تھا سلطانہ اور

اختر کی شادی تو بھی ہو جاتی لیکن اختر کا قول تھا "پہلے کماؤ پھر شادی کرو" اس نے اپنے دل پر جبر کر کے اپنے اس قول پر سختی سے عمل کیا۔ پون سو وہ جانتا تھا کہ سلطانہ ایک کمزور پتی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اسکو کیا کمی لیکن مقورے دن بعد وہ سلطانہ کی آنکھوں میں دلیل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ مانا کہ سلطانہ کو اس سے بے انتہا محبت تھی۔ مگر پھر بھی وہ انسان ہی تو تھی۔ اسکو ڈر تھا کہ کہیں سلطانہ کی محبت نفرت سے نہ بدل جائے کیونکہ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ اسکو ڈر تھا کہ کہیں سلطانہ یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ اختر نے اپنی جان کی بازی بیٹے کی لالچ میں لگائی تھی۔ کیونکہ دنیا میں اس قسم کے لوگ بھی موجود ہیں۔ غرض جس طرح بھی ہو سکا اختر نے اپنے دل پر جبر کیا۔ اور شادی کو چند سال کیلئے ملتوی کر دیا۔ لیکن جس سمیٹی اور اضطراب سے یہ زمانہ گزرا کچھ اختر ہی کا دل جانتا ہے۔

ہر حال اب وہ دن آ گیا تھا۔ اختر کی بوڑھی ماں آج سید خوش تھی اپنے بیٹے کی کھلی ہوئی باپھیں بکھیر اس کا دل باغ باغ ہوا جا رہا تھا۔ ... لیکن اسوقت ایک شخص اسے بری طرح یاد آ رہا تھا۔ وہ ہوتا تو وہ بھی کتنا خوش ہوتا آج کے دن۔۔۔ آہ، اختر کا باپ، اس دن کیلئے نہ رہ سکا۔ کاش وہ بھی اختر کی اس خوشی کو دیکھ سکتا۔۔۔ اسے کیا خبر کہ آج اختر کی شادی ہو رہی ہو۔ سلطانہ جیسی چینی کی گڑیا کے ساتھ۔۔۔ خدا کرے ساریں کی طرح محبت کر نیوالا یہ سنس کا جوڑا پھلے پھوے۔۔۔ شادی ہے۔ آمین۔ بڑی بی اختر کو گھر سے لگا کر رو پڑیں۔

کیا دکھا ہوا میں دنیا میں سوئے آنسوؤں کے۔۔۔ رنج میں بھی آدمی روتا ہے اور

(ختم مشلا)



ALLAMA IQBAL LIBRARY



25214

THE JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY.

DATE LOANED

Class No. 191.11 Book No. 1111

Vol. _____ Copy _____

Accession No. 10111

2 JUN 1971

17 MAY 1977



**ALLAMA
IQBAL LIBRARY**

**UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN**